ماھنامہ

حکمت بالغہ

اپریل 2007

مدیر: انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس: 0092-47-7628361

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ www.hamditabligh.net پر حکمت بالغہ کے تمام شمارے دستیاب ہیں

فرمانِ خداوندی

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ☆

اور قوم فرعون کے پاس بھی ڈر سنانے والے آئے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ☆

انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو اس

طرح پکڑ لیا جس طرح ایک قوی اور غالب شخص پکڑ لیتا ہے

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ ☆

(اے اہل عرب) کیا تمہارے کافر ان لوگوں سے بہتر ہیں یا

تمہارے لئے (پہلی) کتابوں میں کوئی فارغ خطی لکھ دی گئی ہے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ☆

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری جماعت بڑی مضبوط ہے

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ☆

عنقریب یہ جماعت شکست کھائیگی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگ جائینگے

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ☆

ان کے وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور قیامت بڑی سخت اور بہت تلخ ہے

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِى ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ☆

بے شک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ط ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ☆

اس روز منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے۔ اب آگ کا مزہ چکھو

اِنَّا كُلَّ شَىْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ☆

ہم نے ہر چیز اندازۂ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے

وَمَآ اَمۡرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ ☆

اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک بات ہوتی ہے

وَلَقَدۡ اَهۡلَكۡنَآ اَشۡيَاعَكُمۡ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ ☆

اور ہم تمہارے ہم مذہبوں کو ہلاک کر چکے ہیں تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟

وَكُلُّ شَىۡءٍ فَعَلُوۡهُ فِى الزُّبُرِ ☆

اور جو کچھ انہوں نے کیا (انکے) اعمال

ناموں میں (مندرج) ہے

وَكُلُّ صَغِيۡرٍ وَّكَبِيۡرٍ مُّسۡتَطَرٌ ☆

(یعنی) ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے

اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ☆

جو پرہیزگار ہیں وہ باغوں اور نہروں میں ہونگے

فِىۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ ☆

(یعنی) پاک مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے

والے بادشاہ کی بارگاہ میں

صدق اللہ العظیم

حرفِ آرزو

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کا دل کی گہرائیوں سے شکر ہے کہ اس نے ہمیں دیگر بے شمار نعمتوں کے ساتھ ساتھ ''حکمت بالغہ'' کے ذریعے 'اظہار' اور 'بیان' کا ایک ذریعہ عطا فرمایا۔ حکمت بالغہ کا چوتھا شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ ادارہ نے حتیٰ المقدور کوشش کی ہے اس جریدہ کو ظاہری طور پر بھی 'بھلا' اور 'قبول صورت' بنا کر پیش کیا جائے اور اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے سنگل کلر پرنٹنگ میں جتنا اچھا ٹائیٹل بن سکتا ہے بنانے کی کوشش کی اور معنوی لحاظ سے بھی ہماری مخلصانہ کوشش ہے کہ حکمت بالغہ (MATURE WISDOM) کے عنوان سے حکمت وحی, حکمت نبوی ﷺ اور حکمت انسانی جو ''خیر کثیر'' کا مصداق ہو کے نادر نمونے آپ تک پہنچائے جاتے رہیں۔ بامقصد تحریریں متنوع عنوانات اور قارئین کے لئے ابلاغ کے نقطہ نظر سے اچھا مواد فراہم کرنے پر ابھی بھی پوری توجہ کی ہے اور اس رُخ مزید بہتر بنانے کی سعی کرتے رہیں گے۔ قرآن مجید اور دین کی بات کو صحیح موقع، صحیح انداز اور صحیح اسلوب کے ساتھ پیش کرنے میں جتنی نفاست اور پختگی درکار ہے اس کے حصول کی طرف سفر جاری رہے گا (ان شاء الله)۔

پہلے شمارے میں بھی عرض کیا تھا اور اب دوبارہ یہ گزارش پیش خدمت ہے کہ قارئین اپنے مفید مشوروں، تاثرات اور احساسات کو بطور FEED BACK ہمیں ضرور ارسال کرتے رہیں تا کہ اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

اللھم اجعلنا فی اعیینا صغیرا و فی اعین الناس کبیرا۔ آمین

ماہ اپریل اس دفعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ موقع بہار کا موسم تو ہوتا ہی ہے۔ اس دفعہ یہ مہینہ ربیع الاول کی جلو میں آ رہا ہے۔ 12 ربیع الاول کو ماہ اپریل کا آغاز ہے۔ اگرچہ اس طرح مہ وسال کی آمد سے عقائد و نظریات اور ایمانیات کے میدان میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا تاہم اس موسم میں بہار کے تذکرے بھی ہوں گے اور حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ٹی وی، ریڈیو، اخبارات، رسائل اور جرائد میں ہر جگہ خصوصی پروگرام بھی ہوں گے اور بڑے اہتمام سے

آپ ﷺ کے تذکرے ہوں گے۔ایسے ماحول میں جب عام طور پر لوگ حضرت محمد ﷺ کی باتیں اور تذکرے سننے پر آمادہ ہوں۔ہمارے لئے بھی اس موضوع پر اظہار خیال اور دوسروں کو صحیح رُخ پر کام کرنے کے لئے متوجہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ان مواقع سے ایک داعی اور دین کا خادم صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کا اہل ہی نہیں مسئول بھی ہے۔

نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے دو پہلو اس موقع پر قابل توجہ ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی جو شانیں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں ان میں سے نمایاں شانیں ان کا ''بشیر'' اور ''نذیر'' ہونا ہے۔شان رسالت ﷺ میں نذیر ہونے اور انذار کا پہلو غالب ہے یعنی اگر کوئی قوم اور لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں گے اور توجہ دلانے اور وعظ و تبلیغ کے علی الرغم اپنی ضد نہیں چھوڑیں گے اور بعض صورتوں میں انکار کے ساتھ ان حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور صلحاء کے ساتھ بدتمیزی اور دست درازی کی راہ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں پکڑے گا اور عذاب میں مبتلا کر دے گا اور اس عذاب کو کوئی ٹال نہیں سکے گا۔یہ انذار اور ڈرانا اور منکرات والی زندگی گزارنے پر عذاب کی وعید صرف انبیاء کرام اور کلام خداوندی کی شان ہے ورنہ دنیا کی کوئی دوسری کتاب اس طرح نہ ڈرا سکتی ہے۔اور نہ کوئی انسان علاوہ انبیاء کرام کے اس طرح کا طرز تخاطب اختیار کرتا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔جناب حضرت محمد ﷺ کی یہ شان بھی نمایاں ہے اور آپ نے خود بھی اور قرآن مجید نے بھی اپنے دور میں اہل عرب بنی اسمٰعیل علیہ السلام کو اہل کتاب بنی اسرائیل کو ڈرایا ہے۔اور رہتی دنیا تک کے لئے یہی پیغام چھوڑا ہے۔

خود قرآن مجید جو کلام الٰہی ہے اپنی سب سے بڑی شان یہی بیان کرتا ہے فرمایا!

تبرك الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعٰلمين نذيرا

(فرقان 1)

ترجمہ: ''وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ اہل عالم کو ہدایت کرے''۔

فذكر انما انت مذكر لست عليهم بمصيطر (الغاشیہ)۔

ترجمہ: ’’ تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو تم ان پر داروغہ نہیں ہو‘‘۔

آج کا انسان جس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے اور عصیان اور فساد عالمی سطح پر پھیل چکا ہے اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ماننے والوں کی ذمہ داری ہے کہ انسانیت کو عذاب سے بچانے کے لئے خود بھی آخری آسمانی ہدایت پر عمل کریں اور آگے بڑھ کر یہ ذمہ داری ادا کرتے ہوئے دوسروں کو بھی متوجہ کریں اور یوں انسانیت کو نافرمانی کی صورت میں ناگزیر تباہی اور عذاب سے بچانے کی کوشش کریں۔

یہی آپؐ کا فرض منصبی تھا جو آپؐ نے سرانجام دیا اور یہی ہمارے لئے راہ عمل اور اسوہ حسنہ ہے۔

دوسری شان آپ ﷺ کی ’’رحمۃ للعالمینی‘‘ کی شان ہے عام تصور یہ ہے کہ آپؐ کی یہ شان اصلاً تو آخرت کے دن ظاہر ہوگی۔ جب آپ امت کیگنہگاروں کو شفاعت کے ذریعے بخشوائیں گے اور دوزخ سے رہائی دلائیں گے۔ دنیا میں یہ شان اول تو ظاہر ہونے والی نہیں اگر اس کا کوئی پرتو ہے بھی تو صرف اتنا ہے کہ امت کے پارسا اور تہجد گزار اور کثرت سے درود شریف پڑھنے والوں کو خواب میں آپ ﷺ کی زیارت ہو جائے یا خواہش اور دعاؤں کے نتیجے میں آخری عمر میں ہی سہی مدینے کی باریابی ہو جائے اور مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی نمازیں نصیب ہو جائیں اور روضہ رسول ﷺ پر درود شریف پڑھنے کی سعادت نصیب ہو جائے یا وہاں موجود ’’شرطوں‘‘ سے آگے بڑھنے سے روکنے پر تلخی ہو جائے اور کچھ دھکے کھا لئے جائیں ___ بس۔

حالانکہ آپ ﷺ کی شان رحمۃ للعالمینی کا مظہر یہ بھی ہے کہ اسی زندگی میں آپ کی تعلیمات کی طرف رخ کیا جائے۔ آپؐ کے اعلیٰ مقام کو پہچانا جائے۔ ایمان لایا جائے، آپ کی تعلیم پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل کیا جائے۔ تو عدل اجتماعی کی وہ شکل بنتی جس کو عرف عام میں خلافت راشدہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ ایسی عالمی رحمت ہے اور عمومی لطف و کرم کی

چادر ہے کہ مسلم اور غیر مسلم سب رعایا کی حیثیت سے اس سے مستفیض ہوتے ہیں۔خلافت راشدہ میں یہ نظام لوگوں نے دیکھا۔محسوس کیا اور اس کی برکات سے فائدہ اٹھایا کہ :۔

اس میں کوئی ظلم نہیں۔

لوٹ کھسوٹ نہیں۔

ناانصافی نہیں۔

عدل وانصاف گھر کی دہلیز پر میسر ہے۔

عورتوں،مردوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں عزت واحترام حاصل ہے

اور حقوق ومراعات حاصل ہیں۔

کسی عورت کی عزت نہیں لٹتی۔

کوئی شخص بھوکا نہیں سوتا۔

کوئی مجرم سفارش سے چھوٹ نہیں سکتا۔

مجرم بڑے سے بڑا آدمی ہو قانون کے شکنجے میں آ کر رہے گا اور قانون سے

بچ کر نہیں جا سکتا۔

عورت کی عزت وعصمت کی حفاظت ہے۔

عورت کو کمانے سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا وہ معاشی تفکرات سے آزاد ہو کر آئندہ

نسل کی پرورش کر رہی تھی اس لئے کہ بچے کے لئے پہلی درسگاہ ماں کی گود ہی ہے

اس خلافت راشدہ کے دوران مساوات تھی اور رنگ ونسل ،جنس، زبان، پیشہ، مال و دولت کی بنیاد پر کوئی امتیازات نہیں تھے۔عہدے اور مناصب اہلیت کی بنیاد پر ملتے تھے اور کالے گورے کی تمیز نہیں تھی۔آج بھی دنیا ایسے ہی عادلانہ اور منصفانہ نظام کی پیاسی ہے اور متلاشی ہے مگر یہ نظام کہیں نظر نہیں آتا کہیں کوئی امید نظر آتی ہے تو انسان اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے مگر کئی صدیوں سے ساری محنت اور کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو پا رہی۔

آج کا انسان اس طرح ٹھوکریں کھا رہا ہے کہ وہ اپنی گمشدہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کو حاصل کرے۔

عالمی جمہوری فلاحی ریاست کا سہانا خواب ایک خواب سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اسلام کے علمبرداروں کے پاس قرآن، حضرت محمد ﷺ کی سنت اور خلافت راشدہ کی روایات کی شکل میں رحمۃ للعالمینی کا عالمی فلاحی نقشہ موجود ہے مگر بدقسمتی سے ہمیں خود اس کا احساس نہیں۔

مستقبل کی عالمی جمہوری فلاحی مملکت لامحالہ۔

ایک اسلامی مملکت ہے۔

جو قرآنی تعلیمات اور حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی روشنی میں وجود میں آئے گی۔

جس سے دنیا کا ہر انسان چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم فیضیاب ہوگا اور اس کی برکات سے عدل وانصاف اور انسانی حقوق اس کو اپنے گھر کی دہلیز پر میسر آئیں گے اور انسان کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔ اور نہ کسی کی عزت لٹے گی نہ ڈاکے اور قتل ہوں گے۔

وہ دن ہوگا _____ نبی اکرم ﷺ کی شان رحمۃ للعالمینی کے عالمی سطح پر ظہور کا دن، ان کے رفعنالك ذكرك کی شان کو بچشم سر دیکھنے کا دن۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو دنیا میں ایسا نظام لانے کی سوچتے ہیں۔

اس کے لئے جاگتے ہیں۔

سوتے ہیں۔

اس کے لئے کھاتے ہیں، پیتے ہیں، محنت کرتے ہیں۔

یہی لوگ بقول حضرت عیسےٰ علیہ السلام زمین کا نمک ہیں۔

اور _____ انسانیت کا حاصل ہیں۔

کاش دنیا میں عدل اجتماعی کا یہ روحانی (DIVINE) نظام جلد قائم ہو سکے اور انسانیت اس کے سایہ میں امن وسکون سے رہ سکے۔ مغرب بالخصوص امریکہ (یا در پردہ یہود) سے تو ایسے عادلانہ ومنصفانہ عالمی نظام کی توقع عبث ہے۔

آج دنیا میں امریکہ کا غلبہ ہے اور اس نے گزشتہ چند سالوں میں افغانستان اور عراق کو

تاراج کر دیا ہے سنا ہے ایران کی باری ہے پھر شاید پاکستان یا سعودی عرب کے بارے میں بھی مشوروں کی نوبت آ جائے تاریخ عالم میں فاتحین اور جنگجوؤں کی ایک طویل اور چونچکاں فہرست ہے امریکہ نے اس ملک گیری کی ہوس میں بدنام فاتحین کی اس فہرست میں اپنا نام شاید سب سے اوپر لکھوا دیا ہے۔

آج مسلمان کمزور ہیں اور امریکہ کے مقابلے کی سکت نہیں رکھتے امریکہ عراق کو فتح کر کے امریکہ کی 54th ریاست بنا لیتا اور وہاں لوگوں کو وہی حقوق دے دیتا جو سابقہ امریکی ریاستوں میں انسانوں کو میسر ہیں تو اہل اسلام کا غم شاید آدھا رہ جاتا اور افغانستان کو 55th ریاست کا درجہ دے دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ شاید امریکی ذہن، امریکی شہریوں کے علاوہ دوسروں کو انسان ہی نہیں سمجھتا یا ممکن ہے کوئی وجہ ہو!۔

ماہ اپریل علامہ اقبال کے یوم وفات (21 اپریل) کے حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ حکومتی ذمہ داران بیانات دیتے ہیں اخبارات میں خصوصی ایڈیشن شائع ہوتے ہیں سیمینار ہوتے ہیں یوم اقبال منایا جاتا ہے اور بس۔

مفکر پاکستان کی حیثیت سے علامہ اقبال کے احسانات ہم پر بہت زیادہ ہیں مگر کوئی ان دیکھی قوت ہے جو اس ملک کو اس راہ پر چلنے نہیں دیتی پاکستان بننے کے تقریباً 30 سال بعد ایوان اقبال کا خاکہ تیار ہوا اور پھر چند سالوں میں منصۂ شہود پر آ گیا۔ اب شاید دوبارہ موقع ہے کہ اس سمت میں ایک قدم اور اٹھایا جائے۔ اگر ممکن ہو سکے تو نظام تعلیم کو اسلام یعنی قرآن مجید یا صحیح تر الفاظ میں تصور توحید کے تابع کر دیا جائے۔ یہ معاملہ تفصیل طلب ہے ان شاء اللہ آئندہ اس پر گفتگو ہوگی۔ علامہ اقبال ہی کا یک مضمون Islamic Education نامی پرچے سے ہدیہ قارئین ہے جس کا عنوان ہے۔ ''بے خدا سائنس کے خلاف علامہ اقبال کی جنگ''

بے خدا سائنس کے خلاف علامہ اقبال کی جنگ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

زمانہ جدید کے سائنسی علم کی بے خدائیت کے خلاف جس عظیم مفکر نے عہد حاضر میں سب سے پہلے اپنی آواز بلند کی وہ علامہ اقبالؒ ہی تھے۔ ان کے دردناک اور پرسوز اشعار میں یہ شعر بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے:۔

عشق کی تیغ جگردار اڑائی کس نے؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

یعنی اے ساقی وہ کون ہے جس نے عشق الٰہی کی خاراشگاف تلوار کو چرالیا ہے (کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ) سائنسی علم کے ہاتھ میں خالی نیام ہی رہ گئی ہے (اور وہ تیغ جگردار غائب ہے) یہ کس نے اڑائی ہے؟

بعد ازاں کئی دیگر مفکرین نے بھی اس بات کو دوہرایا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر پی ساروکن بھی جو کہ ہارورڈ یونیورسٹی میں محکمہ عمرانیات کے چیئرمین رہ چکے ہیں اور جو مجلّہ کرسچین مانیٹر کے بقول ہمارے زمانے کے عظیم ترین حکمائے عمرانیات میں سے ایک ہیں، اپنی کتاب موسوم بہ ''ہمارے زمانے کا بحران'' میں رقم طراز ہیں:۔

''مذہب اور سائنس کے درمیان عہد حاضر میں زبردست تضاد و اختلاف دراصل غیر حقیقی اور غیر ضروری ہے چہ جائیکہ یہ تباہ کن بھی ہو۔ کسی موزوں نظریۂ حقیقتِ صادقہ اور قدر صحیحہ کی روشنی میں مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی ہیں اور دونوں ایک ہی مقصد کی تکمیل کر رہے ہیں اور وہ مقصد یہ ہے کہ حقیقتِ مطلق کو یوں بے نقاب کیا جائے کہ اس کی بدولت عظیم تر شرفِ انسانی ظہور میں آتا چلا جائے اور جلال خداوندی بھی تابندہ تر اور قوی تر ہوتا چلا جائے۔''

پروفیسر ساروکن کے یہ الفاظ علامہ اقبالؒ کے ان دو اشعار کا قریب قریب ترجمہ ہی معلوم ہوتے ہیں:۔

وہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء
مقام فکر ہے پیمائش زمان و مکاں مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

یہ تو صرف اس شخص کی تلاش حق کی دو منزلیں ہیں جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ قادر مطلق خدا نے اس کو جملہ اسماء کا علم عطا کر دیا تھا۔ سائنس کی منزل کا تعلق زمان و مکان کی سیاحت و پیمائش کے ساتھ ہے اور عبادت کی منزل کا تعلق اِس عرفان و اعتراف حقیقت کے ساتھ ہے کہ سبحان ربی الاعلیٰ پاک و برتر ہے میرا ہی رب عالی!

اقبالؒ نے اپنی تالیف ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' (شش خطبات) میں فرمایا ہے کہ:۔

''ایک سائنس دان کا عمل جو فطرت کے مشاہدہ و مطالعہ میں مصروف منہمک ہے، ایک عابد کے عمل سے مختلف نہیں ہے، کیونکہ دونوں ایک ہی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اقبالؒ کا وہ شعر جو اس مقالہ کے پہلے فقرہ کے آغاز میں نقل کیا گیا ہے اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک عشق الٰہی کی تلوار کا اصلی اور موزوں ترین مقام سائنسی علم کی نیام کے اندر ہی تھا۔ مگر اس کو بعد میں سرقہ کر لیا گیا ہے۔ یہاں اقبالؒ اس امر واقع کا حوالہ دے رہے ہیں جو کہ زمانہ مابعد سے لے کر اب تک بالکل اظہر من الشّمس ہو چکا ہے اور جس کے لئے ہم جناب سارٹن اور برفالٹ کی ان تحریروں کے ممنون احسان ہیں کہ ''سب سے پہلے مسلمانان ہسپانیہ نے ہی سائنس کا طریقہ ایجاد کیا تھا اور انہوں نے ہی جدید سائنس کا سنگ بنیاد رکھا تھا'' اس سلسلے میں برفالٹ لکھتا ہے:۔

''ہماری سائنس پر عربوں کی سائنس کا صرف یہ بار احسان ہی نہیں کہ انقلابی نظریات کی خیرہ کن ایجادات و اختراعات ظہور میں ہوئیں بلکہ ہماری سائنس تو تمدن عرب کے اس سے بھی زیادہ گراں قدر احسانات کی ممنون ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنی زندگی بھی تمدن عرب سے ہی حاصل کی تھی۔ زمانہ قدیم جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ دراصل زمانہ ماقبل سائنس تھا، یونانی فلکیات اور ریاضیات بھی دراصل غیر ملکی درآمدات تھیں، جن پر اہل یونان

نے کبھی اپنے پورے تملک اور تسلط کا استحقاق نہیں جتایا تھا۔ دنیا کے ان اولین اور بنیادی سائنس دانوں کی سائنس کا سنگ بنیاد دراصل خدا کا یہ تصور تھا کہ وہ خالق حقیقی ہے۔ جس کی ہستی اور جس کی صفات خود نظارہ فطرت اور مشاہدہ فطرت کے اندر ہی جلوہ گر ہے۔ درحقیقت عربوں کا یہ تصور خدا ہی تھا، جس نے سائنس کو دائرہ امکان میں داخل کیا تھا'' ۔جیسا کہ ہمایوں کبیر معروف ہندی فلاسفر نے جو کہ ماضی قریب تک ہندوستانی کابینہ کے ممبر تھے۔

اپنی کتاب موسوم بہ ''سائنس، جمہوریت اور اسلام'' میں لکھا ہے:۔

''ایک خدا کا مطلب، ایک کائنات، لہذا ایک ہی قانون تھا۔ توحید خداوندی کا عقیدہ ہی سائنس کے ظہور کی شرط اوّل تھا۔ وحدت خداوندی پر اسلام کا زور اس کے سائنٹیفک نقطہ نظر کی بنیاد تھا۔''

جب مسلمانوں کو ہسپانیہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو سائنس ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جن کو اہل یورپ متبعین پال کہتے تھے اور جن کو عام طور پر ماڈرن عیسائی بھی کہا جاتا ہے۔ مسلم سائنس دانوں کے عیسائی مقلدین کا مقدر شاید یہی تھا۔ کہ وہ انسانیت کی بدترین مخالفت اور بدخدمتی کا ارتکاب کریں، جس کی مثال دنیا بھر میں کسی دوسرے انسانی گروہ میں ناپید ہو، حالانکہ مذکورہ گروہ کو علم میں دلچسپی رکھنے کا دعویٰ بھی تھا۔ عقیدہ عیسائیت کی روایات کے زیر اثر جو انسانی زندگی کو دو الگ الگ قیاسی حصوں میں منقسم کرتی ہیں، یعنی مذہبی اور دنیاوی روحانی اور مادی، مقدس اور پلید حصص ۔ یوں ان لوگوں نے خدا کے تصور کو سائنس سے الگ تھلگ کر ڈالا کیونکہ سائنس کو انہوں نے اپنے ذہنی مطالعے کی بنا پر سراسر دنیاوی چیز قرار دے دیا تھا۔ جس کا تعلق مادی دنیا کے مطالعہ و مشاہدہ کے ساتھ تھا۔ دراصل یہ ایک غیر معقول کوشش تھی۔ جس نے زندگی کی کلیت میں تفرقہ اندازی کا بیج بویا۔ جس کے باعث حقیقت واحدہ کو دو ایسے متضاد حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو۔ تاہم سائنس کی ''بے خدائیت'' کا عقیدہ جو کہ عیسائیت کی مقتضیات سے بطریق بالا پیدا ہوا تھا دنیائے عیسائیت میں قائم رہنے کے لئے عرض

وجود میں آ گیا۔ اس تفریق کو مزید تقویت وحمایت چرچ اور سٹیٹ کی علیحدگی سے ملی ہے جبکہ یہ علیحدگی ان دونوں کی اس تلخ اور طویل مناقشت کے نتیجے میں روبہ عمل آ گئی۔ جس کے دوران چرچ نے نہایت ہی بے رحمی اور سنگ دلی کے ساتھ کئی سائنس دانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اندریں حالات صرف اسی قسم کے نظریات سائنس کو ہی فروغ مل سکتا تھا جو کہ چرچ کے عین مطابق ہوں اور جن کو چرچ کی حمایت میں ایک قسم کی شہادت ثابت کرنا آسان متصور ہو سکتا تھا۔ اس قسم کے نظریات میں انیسویں صدی کے مادی اور میکانکی نظریے شامل تھے اور ڈارون کا نظریہ ارتقاء بھی اس زمرہ میں داخل تھا۔ جس کی رو سے فطرت میں کسی تخلیقی اور ہادیانہ قوت کی ضرورت ہی باقی نہ رہ جاتی تھی۔ نتیجتاً وجود خداوندی کی ضرورت بھی مفقود تھی۔ لہذا دنیا بہت جلد اس بات کو بھول گئی کہ سائنس میں نظریہ بے خدائیت کو عیسائیت نے ہی جنم دیا تھا اور بعد ازاں دنیا یہ خیال کرنے لگ گئی کہ اصل میں بے خدائیت کا تقاضا خود سائنس نے ہی کیا تھا۔ عیسائی اہل مغرب اپنے سائنسی علم کو بڑی شدت واحتیاط کے ساتھ ان راستوں سے بچا بچا کر رکھتے تھے، جو تصور خدا کی طرف جاتے تھے۔ اور وہ سائنس کو ہر قیمت پر ان حدود کے اندر مقید رکھتے تھے، جو انہوں نے سائنس کے بارے میں اپنے عقیدہ بے خدائیت کی رو سے مقرر کر رکھی تھیں۔ نتیجتاً وہ اس ذہنی اور تخلیقی سرگرمی کی شہادت کو نظر انداز کر دیتے تھے جو مظاہر فطرت میں فی الواقع توازن، نظم وضبط نظام، منصوبہ بندی، قصد، ارادہ، اختیار، ریاضیاتی فکر، ارتقائی تحریک و جذبہ، خود بخود نشوونما، اعلیٰ سے اعلیٰ تر تعمیل و پیچیدگی کے مراحل کی صورت میں ہمارے مشاہدے میں ہوتی رہتی ہے یا پھر جس شہادت کا ہم کلیت، وحدت، یکسانیت، مقصدیت، ارادیت، تنظیم وترتیب، تطابق اشتراک وتعامل، انتخاب واختیار وغیرہ کی شکل وصورت میں مسلسل وپیہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سائنس دان اپنے عقیدہ بے خدائیت کی بنا پر ان تمام صورتوں کی تشریح وتوضیح نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ جب یہ شہادت چاروں طرف سے ان کو گھیر لیتی تو پھر بھی وہ اس کی تشریح کے لئے اس قسم کے مابعد الطبیعیاتی نظریے ایجاد کرتے ہیں جیسا کہ سر جیمز جینز کا نظریہ ریاضیاتی ذہن یا برگسان کا ولولہ حیات یا ڈریش کی آرزوئے تکمیل وغیرہ وغیرہ،

یہ لوگ تصور خدا سے کبھی استفادہ نہیں کرتے، لیکن اس قسم کی تشریحات بمشکل ہی

مناسب وکافی یا تسلی بخش ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ ''ریاضیاتی تفکر''۔ ''طبیعاتی مظاہر کی صناعی'' جاندار خلیے کی تیاری اور زندگی کی دوڑ جو اعلیٰ سے اعلیٰ تر مراحل تکمیل و پیچیدگی کی طرف جاری و ساری ہے اور جو ان تصورات و نظریات میں بالترتیب مضمر ہے اس کی صفات و خصوصیات صرف اسی کامل و مکمل شخصیت سے پائی جاسکتی ہیں۔ جس میں شخصیت کے جملہ عناصر و اجزائے خصوصی اور صفات موجود ہوں۔ یعنی عقلی، اخلاقی، جمالیاتی، تخلیقی اور جذباتی خواص جن سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔ ایسی کامل و مکمل شخصیت خدا کے بغیر کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔

اگرچہ بے خدا سائنس یہ نہیں کہتی کہ ''کوئی خدا موجود نہیں ہے۔'' پھر بھی یہ اس واحد ماخذ کے آگے ایک دیوار کھینچ کر کھڑی کر دیتی ہے۔ جس سے علم کی روشنی اور عشق الٰہی کی روشنی انسان کو ملتی ہے۔ یعنی فطرت کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کا شعور اور فطرت سے سروکار رکھنے کی سکت پیدا ہوتی ہے کیا یہ بات عقیدہ بے خدائیت کے ساتھ ممکن ہے۔

اقبال نے فرمایا ہے کہ:۔ ع علم حق اول حواس آخر حضور

خدا کا عرفان سب سے پہلے حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور پھر کہیں جا کر بعد میں مراقبہ و غور و فکر کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔

اس طرح بے خدا سائنس پہلے اپنے شکار کو یوں سوچنے اور عمل کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ گویا خدا موجود نہیں ہے۔ یہ تو صاف انکار خدا سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ صاف انکار خدا میں تردید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ (جس سے سائنس صاف بچ نکلتی ہے) یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس نے آدم اور کائنات کے بے خدا فلسفوں کو جنم دیا ہے۔ مثلاً ڈارونیت، مارکسیت، فرائڈزم (فرائڈیئت) ایڈلرزم (ایڈلریت) تجربیت، منطقی اثباتیت اور انسان دوستی کا عقیدہ وغیرہ وغیرہ، اسی لئے تو سائنس نے انسانی طبیعت اور انسانی سرگرمیوں کے بے خدا فلسفے پیدا کئے ہیں۔ بے خدا اخلاقیات، بے خدا سیاسیات، بے خدا معاشیات، بے خدا قانونیات، بے خدا فلسفہ تعلیم، بے خدا فلسفہ تاریخ اور بے خدا نفسیات فرد و اجتماع۔ یہ سب فلسفے مجبوراً انسانی طبع کی اہم ترین حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ انسان کی جملہ عملی سرگرمی کی تحریک محض اپنے کسی نصب العین کے حصول کی خاطر پیدا ہوتی ہے جو کہ سب سے زیادہ کامل اور جمالیاتی نصب العین کے ذریعے ہی تسکین

پاسکتی ہے اور یہ کامل جمال وکمال صرف خدا کی ذات میں ہی اور بہت ہوسکتا ہے، لہذا سائنس کی بے خدائیت کوئی معمولی سادہ اور بے ضرر کتابی تبدیلی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو بدترین بڑی تبدیلی ہے۔ جس سے بنی نوع انسان کے رجحانات اور اطوار ومیلانات متاثر ہوتے ہیں اور جن کے ساتھ ہی ان کے اقدار، پیمانہ جات، نظریات، امیدیں اور ہمتیں، اغراض ومقاصد یکسر بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ بدترین تبدیلی بنی نوع انسان کے اعمال وتحریکات کو متاثر کرتی ہے۔ انسان کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق ہی عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ اگر اس کے خیالات ہی دہریانہ اور بے خدا ہوں گے تو پھر اس کے اعمال بھی غیر خدا اندیش اور کافرانہ ہی ہوں گے۔ لہذا سائنس کی بے خدائیت انسانی سرگرمیوں میں ایک عظیم تبدیلی ہے۔ جس کی وجہ سے فی الواقع تاریخ کا دھارا بدل گیا ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا میں کوئی عالمگیر اور یکساں یا روحانی قوت باقی نہیں رہ گئی جو انسانوں کو اندر سے کنٹرول کرے اور ہدایت کا بندوبست کرسکے۔

یہی ایک وجہ ہے جس کی روشنی میں ہم جدید دنیا کی انسانی سوسائٹی کی خصوصی بدقسمتیوں اور پریشان حالیوں کی تشریح کرسکتے ہیں۔ کبھی نہ ختم ہونے والی عالمگیر جنگیں جو سائنٹفک مہلک ہتھیاروں کے ساتھ لڑی گئیں جن سے عوام موج در موج مارے گئے اور جب ایک جنگ تھمی تو سرد جنگ کا واقعہ درپیش آیا، جس میں زیادہ زور شور کے ساتھ اگلی جنگوں کی تیاری شروع کردی گئی۔ بین الاقوامی اخلاق کی عدم موجودگی، سیاست دانوں کے جھوٹ اور دھوکے جو سیاسی اموات پر منتج ہوتے ہیں اور جن سے مختلف ممالک میں یکے بعد دیگرے شورشیں پیدا ہوتی ہیں۔ اطمینان قلب کا فقدان آج اقتصادی خوشحالی بھی موجود ہے۔ جس سے نفسیاتی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ جرائم کی رفتار تیز تر ہوتی ہے خودکشیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔

آئے دن کی بڑھتی ہوئی قبل از بلوغت جنسی بے راہ روی اور شادی شدہ جوڑوں کی بے وفائی بداخلاقی اور بدتمیزی جو ہر روز ہولناک رفتار اور خوفناک تناسب سے مزید بڑھتی اور پھیلتی چلی جارہی ہے۔ علم کے تقدس کا احساس اور استاد کا ادب ناپید ہورہا ہے۔ جس کے نتیجے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں امن وامان اور نظم وضبط برباد ہورہا ہے۔ بے خدا سائنس نے ہر جدید کالج کو ایسے انسانوں کی تربیت گاہ (نرسری) بنادیا ہے جو خدا اور اخلاق دونوں پر ہنستے ہیں اور ان دونوں کا برابر

کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ تو ہر اچھائی، جمال، حق، نیکی اور خوبی کو قتل کرنے کے برابر ہے اکبرالہ آبادی مرحوم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

(فرعون بچوں کے قتل کے الزام سے صاف بچ نکلتا، مگر افسوس ہے کہ اسے کالجوں کے ادارے کھولنے کی تجویز نہ سوجھ سکی۔)

ایسے ہی حقائق و واقعات کی بنا پر علامہ اقبالؒ نے سائنس کی بے خدائیت کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں　　علم با عشق است از لاہوتیاں

(بے خدا سائنس کو شیطان کے شاگردوں نے پیدا کیا ہے، مگر جو علم خدا کے تصور پر قائم ہو وہ پاک فرشتوں کی تخلیق ہوتا ہے۔)

علم کو از عشق برخوردار نیست　　جز تماشا خانہ گفتار نیست

بے خدا سائنس لفظوں کی تماشا گری (شعبدہ بازی) کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بے ربط نہ ہوگا کہ علامہ اقبالؒ نے خود اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے علم کو عموماً اس علم کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو حواس کی مدد سے حاصل کیا گیا ہے اور یہی سائنس ہے۔ اقبال نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں لکھا ہے۔

''علم سے میری مراد وہ علم ہے جو حواس پر مبنی ہے۔ میں نے عموماً علم کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس قسم کے علم سے ہمیں فطرت کی قوتوں پر قدرت و قبضہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور ہمارے اس قبضہ و قدرت کو مذہب کے تابع فرمان رہنا چاہیے، ورنہ یہ شیطنیت ہوگی۔''

اقبال کے بقول اگر سائنس تصور خدا پر مبنی ہو تو یہ اپنی ترقی و فروغ کی منزلوں میں اپنے آپ کی اصلاح کر لینے کے قابل بھی ہو جائے گی۔ مگر بے خدا سائنس میں یہ صفت و قوت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اس ہدایت کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے جو تصور خدا سے پیدا ہوتی ہے۔

؎ وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
وہ علم بے بصری جس میں ہمکنار نہیں تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

وہ سائنس کا علم جو عشق الٰہی کے ساتھ ہو وہ بالعمل اپنے بتوں کا آپ ابراہیم بن جاتا ہے اور اپنے نتائج کی اصلاح کر سکتا ہے۔ لیکن وہ دوسرا علم محض اندھا پن ہے۔ جس میں سائنسدانوں کے مشاہدات کے ساتھ تجلی موسیٰ کا ظہور نہ ہو۔

علامہ اقبالؒ نے تصور خدا کو سائنس کے ساتھ متحد و واصل کرنے کی ضرورت پر بڑا زور دیا ہے۔ اور ایک مکالمہ بصورت نظم لکھا ہے جو زیرکی اور عشق کے درمیان یعنی سائنس اور حب الٰہی کے درمیان مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمایئے:۔

؎ نگاہم راز دار ہفت و چار است گرفتار کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سو باز کردند مرا با آنسوئے گردوں چہ کار است
؎ چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم بہ بازار افگنم رازے کہ دارم

1۔ میں سات آسمانوں اور چار عناصر کے رازوں سے آگاہ ہوں (یعنی زمین و آسمان کے رازوں کا علم رکھتا ہوں) تمام زمانوں کے واقعات اور ہنگامے میری گرفت میں ہیں۔

2۔ میری نظر اور بصیرت اس مادی دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے تھی مجھے اس دنیا سے کیا سروکار جو کہیں آسمانوں کے اس پار ہے۔

3۔ اس ساز اور باجے میں جو میرے قبضے میں ہے، ہر طرح کے راگ اور نغمے پوشیدہ ہیں، میں ان رازوں کو عام لوگوں کے سامنے برسر بازار بیان کر دیتا ہوں، جو میرے علم میں آجاتے ہیں۔

عشق کا جواب ملاحظہ فرمایئے:۔

؎ نہ افسون تو دریا شعلہ زار است ہوا آتش گزار و زہر دار است
چو با من یار بودی نور بودی بریدی از من و نور تو نار است
نجلوت خانہ لاہوت زادی ولیکن در نخ شیطان فتادی

بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز　　تہ گردوں بہشت جاوداں ساز
بیا یک ذرہ از درد دلم گیر　　جہان پیر را دیگر جواں ساز
ز روز آفرینش ہمدم استیم　　ہماں یک نغمہ راز یر و بم استیم

مجھے اعتراف ہے کہ تیرے پاس جادو کی قوتیں ہیں۔ مگر تو نے مجھ سے دور ہو کر دنیا کو دوزخ بنا ڈالا ہے، تو نے دریاؤں اور سمندروں میں آگ لگا دی ہے۔ (جنگی جہازوں سے بمباری کا حوالہ) اور فضا میں بھی آگ اور زہر کو پھیلا دیا ہے (ہوائی جہازوں سے بمباری و زہریلی گیس پھینکنے کی طرف اشارہ) جب تک تو میری طرف دوستانہ نگاہ رکھتا تھا۔ اس وقت تک تو ایک روشنی کی مثال تھا اور اب جبکہ تو مجھ سے کٹ چکا ہے، تو آگ بن گیا ہے۔ میری طرح تو بھی روحانی دنیا کے طبقات میں پیدا ہوا تھا۔ مگر اب تو شیطان کا شکار بن چکا ہے۔ آ کہ ہم دونوں مل کر اس دنیا کو بہشت بنا دیں۔ میرے درد دل کا ایک ذرہ لے لے اور اس قدیم بوڑھی ہوتی ہوئی دنیا کو پھر سے جواں سال بنا دے۔ کیونکہ ہم دونوں روز ازل سے دوست چلے آتے ہیں۔ اور ہم دونوں ایک ہی نغمہ کے زیر و بم ہیں۔

علامہ اقبالؒ یہیں نہیں رک جاتے۔ چونکہ انہیں یقین واثق ہے۔ کہ زیر کی یعنی سائنس کے ساتھ تصور خدا کے اتحاد اور وصل سے ایک جدید عالمگیر ذہنی و عقلی انقلاب برپا ہوگا۔ لہذا وہ مسلمانوں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ سائنس کے ساتھ تصور خدا کا اتحاد پیدا کر کے دنیا میں اس انقلاب کو برپا کر دیں۔ ؎

؎　غریباں راز یر کی راز حیات　　شرقیاں را عشق رمز کائنات
زیر کی از عشق گردد حق شناس　　کار عشق از زیر کی محکمہ اساس
عشق چوں با زیر کی ہمبر بود　　نقشبند عالم دیگر بود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ　　عشق را با زیر آمیزدہ

1۔ مغربیوں کے لئے سائنس ہی حسن و جمال حیات ہے۔ شرقیوں کے لئے عشق الٰہی راز حیات ہے۔

2۔ سائنس عشق کی بدولت اسرار حیات سے آگاہ ہوتی ہے، جبکہ عشق الٰہی کے کاروبار میں

سائنس کے ذریعے مستحکم بنیاد میسر آتی ہے۔

3۔ جب عشق الٰہی سائنس کے ساتھ واصل و متحد ہو جاتا ہے تو زندگی کا نیا نظام معرض وجود میں آ جاتا ہے۔

4۔ اے مسلم؟ اٹھ بیدار ہو، اور سائنس کو عشق الٰہی سے متحد کر کے ایک نیا نظام جہاں پیدا کر کے دکھا دے۔

اس امر کی نا قابل تشکیک اور قطعی شہادت موجود ہے کہ ہمارے نظریہ ونصب العین میں ایسی ایسی طاقتیں پوشیدہ ہیں کہ ہم ان کی بدولت سائنس کو تصور خدا کے ساتھ متحد اور واصل کر دینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور یوں اس جدید عالمی نظام کو برپا کر سکتے ہیں جس کی پیش گوئی علامہ اقبالؒ نے کی ہے۔ تمت بالخیر

_____(ترجمہ: چودھری نبی احمد)

قرآن مجید کی پانچ بنیادی اصطلاحات

نور　　ہدایت　　حیات وممات　　ارادہ　　صلوٰۃ

گذشتہ ماہ مارچ 07ء کے حکمت بالغہ میں قرآن مجید کی پانچ بنیادی اصطلاحات کے سلسلہ میں پہلے ''نور'' کے لفظ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔ اس شمارے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے لفظ ''ہدایت'' پر خیالات کو یکجا کیا گیا ہے۔ تاکہ قارئین کے ذہن میں قرآن مجید کے حوالے سے ان اصطلاحات کا ایک جامع تصور (CONCEPT) ذہن نشین ہو جائے جو ہر موقع پر انسان کو صحیح رہنمائی دے سکے اور آئندہ دوران مطالعہ سامنے آنے والے مختلف زاویہ ہائے فکر کو ان کے صحیح پس منظر میں صحیح جگہ رکھا جا سکے اور ان کو اتنی ہی اہمیت دی اور اسی طرح سے فوقیت دی جائے۔ جس اہمیت اور فوقیت کے وہ اس تناظر میں مستحق قرار پاتے ہیں۔ بلاوجہ کسی خیال کو نہ سنتے ہی رد کر دینا چاہئے۔ اور نہ ہی کسی بات کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لینا چاہئے۔

ھدایت

لفظ ہدایت کا مادہ ھ، د، ی ہے اس سے ھدایت مصدر ہے اور ثلاثی مجرّد میں ھادی (ہدایت دینے والا) اسم فاعل اور مھدیّ (ہدایت یافتہ) اسم مفعول ہے ثلاثی مزید میں یہ لفظ بابِ افعال میں ھدیہ دینے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ جبکہ باب افتعال میں اسم فاعل مھتد استعمال ہوتا ہے قرآن مجید میں اس مصدر سے الفاظ کثرت سے آئے ہیں۔

الهداية دلالة بلطف۔
ومنه الهدية و هوادی الوحش
ای متقد ماتها الهادية لغيرها۔
و خص ماكان دلالة "بهديتُ"
وما كان اعطاءً" باهديتُ"
نحو: اهديتُ الهدية و هديتُ
الى البيت۔
ان قيل كيف جعلت الهداية
"دلالة بلطف" ؟و قد قال الله
تعالىٰ فاهدو هم الى صراط
الجحيم ☆
ويهديه الى عذاب السعير۔
قيل ذٰلك استعمل فيه
استعمال اللفظ على التهكم
مبالغةً فی المعنیٰ كقوله:۔
فبشر هم بعذاب اليم
وقول الشاعر:
تحيّةُ بينهم ضربُ وجيع

ہدایت کے معنی ہیں کہ مہربانی اور خیر خواہی کے ساتھ رہنمائی کرنا (درست راستہ بتانا)۔
اوراسی سے ہے''ھدیہ''۔اوراسی سے ھوادی الوحش یعنی جانوروں کے آگے چلنے والا جو کہ دوسروں کی رہنمائی کرتا ہے۔
رہنمائی کے لئے''ھدیت''خاص ہے(یعنی مجرد سے آتا ہے)اور ہدیہ دینے کے لئے''اھدیت''خاص ہے(یعنی باب افعال سے آتا ہے)جیسے''اھدیت الھدیة''میں نے تحفہ دیا۔''ھدیت البیت''میں نے گھر کی طرف رہنمائی کی۔
اگر یہ اشکال ہو کہ ہدایت کے معنی''مہربانی اور خیر خواہی سے رہنمائی کرنا''کیسے ہوسکتا ہے۔جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے''ان کو جہنم کے راستے کی ہدایت کردو''۔
اور''وہ ان کو سخت آگ کے عذاب کی طرف ہدایت کریگا''۔
تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ معنی میں مبالغہ کرتے ہوئے استہزاء کے طور پر استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے''ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سناؤ''اور شاعر کا قول ہے''ان کا آپس میں سلام دردناک مار ہے''

کلام الٰہی میں لفظ ہدایت ایک دینی اور مذہبی اصطلاح کے طور پر آیا ہے تو یہاں یہ لفظ اپنے خاص معنیٰ میں استعمال ہوا ہے یعنی خالق ارض وسماء ,معبود حقیقی اور رب العالمین کی ہدایت کلام الٰہی میں جہاں جہاں کسی انسان کیلئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے تو اس اصل ہدایت کے حوالے سے ہی ہوا ہے اور اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں مدد دینے کے لئے ہی آیا ہے۔

رب العالمین کی کسی بھی شان پر گفتگو ہوتو عام طور پر ایک مشکل ہر انسان کو پیش آتی ہے کہ ہم انسانوں کی کوتاہ بینی اور کوتاہ فہمی کے ساتھ ساتھ ایک خارجی مجبوری زبان کے استعمال میں الفاظ اور تراکیب کی قلت ہے اور دنیا بھر میں اس تنگ دامانی کے سبب وہی الفاظ جو عام انسانوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں بعینہ وہی الفاظ خالق کائنات کے لئے بھی استعمال کرنا پڑتے ہیں اس لئے کہ اس موقع پر ہمارے سامنے کوئی علیحدہ الفاظ ہی نہیں ہوتے اور نہ ہی ایسے الفاظ بنے ہیں اور نہ زیر استعمال ہیں بالفرض ایسے الفاظ اور افعل التفضیل کے صیغے نکال بھی لئے جائیں تو بھی ہم مخلوق کے محدود ذہن خالق ارض وسماء کی لامحدود شانوں کا تصور ہی نہیں کر سکتے اس کو الفاظ کے احاطہ میں لانا تو زیادہ مشکل مرحلہ ہے۔_____ لہٰذا حاصل کلام یہ ہے کہ اس مجبوری کو ایک ناگزیر ضرورت اور ''مجبوری'' ہی کے درجے میں رکھ کر سلسلہ کلام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور دوران کلام یہ حقیقت کسی لمحے بھی ذہن سے اوجھل نہ ہو تو اچھا ہے قلم کے ذریعے نکلے ہوئے الفاظ میں ''جھول'' اور ٹیڑھا پن نہیں آئے گا۔ اور اگر ذرا سی غفلت ہوگئی تو الفاظ گڈمڈ ہو جائیں۔ قلم لڑکھڑا جائے گی اور مفہوم بدل جائے گا۔ مخلوق کا مقام ''معاذ اللہ'' خالق کے برابر نظر آ رہا ہوگا اور خالق کو مخلوق کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے گا۔ اعاذنا الله من ذالك۔

چنانچہ لفظ سماعت، بصارت، حیات، ارادہ، علم اور ہدایت جب سیاق کلام میں اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے لئے استعمال ہوں گے اور مفہوم اور معانی اس ذات باری تعالیٰ کے شایان متصور ہوں گے اور مضمون نگار اور قائین کرام کو اس پر نگاہ رکھنی چاہئے اور جب سیاق کلام میں عین وہی الفاظ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے آئیں گے یا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین یا تابعین اور دیگر اکابرین امت کے لئے آئیں گے یا اولیائے کرام اور صلحائے کرام کے لئے مستعمل ہوں گے اور ذہن میں ان ہستیوں کے مقام و مرتبے کی مناسبت اور مخلوق اور خالق کا فرق ذہن میں رکھتے ہوئے ہی ان کا مفہوم متعین کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی شان دیکھنا اور سننا ہے یعنی اللہ تعالےٰ بھی دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور ہم انسان بھی دیکھتے اور سنتے ہیں مگر یہ

بات نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا دیکھنا اور سننا بالکل ''چیزے دیگر'' ہے اور انسانوں کا دیکھنا اور سننا ''اور'' ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے صفت کے طور پر 'حی'' ہے ہم زیادہ سے زیادہ ''الحیّ'' کہہ دیں گے اور ہم انسان بھی زندہ ہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ کا ''الحی'' ہونا اور ہمارے زندہ ہونے میں آسمان اور زمین کا فرق ہے اس اللہ کی زندگی حقیقی، ذاتی اور لامحدود ہے جبکہ ہماری زندگی عارضی مستعار اور نہایت محدود ہے۔

لفظ ہدایت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے نظام قدرت میں دائیں بائیں مشاہدہ کریں تو طرح طرح کی مخلوقات نظر آتی ہیں فضاؤں میں، سطح زمین پر، خشکی پر اور سمندر میں۔ زمین کے اندر اور آسمانوں میں مختلف مزاج اور مختلف صلاحیتوں کی ہزاروں قسم کی مخلوقات ہیں جن میں ایک انسان خود ہے۔ ہر شئے یا مخلوق جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے اس کو بنایا سنوارا ہے اور اس کے حصے کا اس کارخانہ قدرت میں جو کام ہے اس کی اس کو سوجھ بوجھ اور ہدایت دی ہے اور سب کچھ اس کی تخلیق ہی میں ودیعت شدہ ہے اس ہدایت کو جبلّی سطح کی ہدایت کہیں تو صحیح ہے اور یہ حیوانیت کی بھی سب سے نچلی سطح ہے۔ اگرچہ اس سطح پر بھی انسان کو دی گئی جبلی ہدایت دوسری مخلوقات سے اپنی شان (Quality) کے اعتبار سے اعلیٰ ہے اس سطح پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ:۔

سبح اسم ربك ا لا علیٰ الذی خلق فسوی والذی قدر فھدی۔ (الاعلیٰ)

ترجمہ: ''اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو جس نے (انسان کو) بنایا پھر (اس کے اعضاء کو) درست کیا اور جس نے (اس کا) اندازہ ٹھہرایا پھر (اس کو) رستہ بتایا۔

بعض انسان اسی حیوانی سطح پر زندگی گزارتے ہیں یا غلط کاریوں اور ضد اور قبول ہدایت سے انکار کی وجہ سے نیچے گر جاتے ہیں اور گرتے گرتے یہاں تک گر جاتے ہیں کہ وہ اب کسی اعلیٰ و

ارفع مقام کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ سورۃ یٰسین میں ایسے ہی لوگوں کا قول نقل ہوا ہے کہ ہمیں کسی خارجی رہنمائی یا ہدایت کی ضرورت نہیں انسان خود مکتفی (Self Sefficient) ہے اپنی عقل اور تجرباتی علم کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور نتیجۃً آسمانی وحی سے انکار کر دیتے ہیں۔

فرمایا! وما انزل الرحمٰن من شیء۔

ترجمہ: ''اور خدا نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی''۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے پاس ہدایت لے کر گئے تو فرعون نے کسی خارجی ہدایت اور خالق کائنات کی عام انسانی زندگی کے بارے میں اوامر و نواہی کو ''مداخلت'' خیال کرتے ہوئے پوچھا۔

اے موسیٰ (علیہ السلام) آپ (دونوں) کا رب کون ہے؟۔ جس پر موسیٰ علیہ السلام نے جواباً ارشاد فرمایا!

ربنا الذی اعطیٰ کل شی ء خلقه ثم هدیٰ (طٰہٰ 50)

ترجمہ: ''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی پھر راہ دکھائی''

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر توجہ نہیں دی اور خود بھی اور اپنی قوم اور عمائدین سلطنت (آل فرعون) کو غلط سوچ کا حامل بنا دیا چنانچہ فرمایا!

و اضل فرعون قومه وما هدی۔ (طٰہٰ 79)

ترجمہ: ''اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا اور سیدھے راستے پر نہ ڈالا''۔

گویا دنیا میں مختلف درجے کی مخلوقات میں عام مخلوقات تو جبلی ہدایت پر ہی قناعت کریں گی مگر چونکہ انسان میں مشاہدہ، جستجو اور تلاش حق کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ اس کے پیش نظر انسان مزید ہدایت اور رہنمائی کی روحانی پیاس اور ضرورت محسوس کرتا ہے چنانچہ تاریخ انسانی میں غور و فکر کے حامل انسانوں کی کمی نہیں رہی ہر دور اور ہر معاشرے میں Thinkers اور فلسفی مزاج کے لوگ ہمیشہ پائے جاتے رہے ہیں۔

اس سطح پر سلامتی طبع اور سلامتی فکر کا مظہر صرف یہ ہے کہ انسان زندگی کے درج ذیل

ناگزیر اور اٹل حقائق کو نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہونے دے جیسے۔

☆ اس دنیا میں انسان اپنی مرضی سے وارد نہیں ہوتا اور بعض بنیادی کیفیات میں بھی اس کی پسند Choice کا کوئی عمل دخل نہیں ہے والدین، رنگ، نسل، صلاحیتیں، عمر، صحت وغیرہ پہلے بھی اور آج بھی ہر آنے والے انسان کے اپنے اختیار اور مرضی میں نہیں ہیں والدین کی چاہت بچے کی چاہت نہیں ہے۔

☆ اس دنیا سے روانگی (موت) بھی کسی کے بس میں نہیں ہے۔ موت کا وقت اور یہ کہ کس طرح کی موت سے وہ دوچار ہوگا کسی کو معلوم نہیں۔

☆ اس دنیا میں جو کچھ انسان کو ملا ہے (از قسم وراثت، مال و دولت، صلاحیتیں، عہدہ، اختیارات، عزت وشہرت وغیرہ) وہ اصلاً مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ کسی بڑے مقصد کیلئے دیا گیا ہے اور وسائل رزق اور صلاحیتوں کے بارے میں صحیح ترین نقطہ نظر ایک امانت اور (SACRED TRUST) کا ہے نہ کہ ملکیت مطلقہ کا۔ ملکیت کا لفظ مجازاً اور استعارۃً ہی بولا جاتا ہے۔ انسان مال و دولت اور صلاحیتوں کو عزت وشہرت کا ذریعہ نہ بنائے اور نہ ہی غریبی اور صلاحیت کی کمی کو ذلت کا سبب سمجھا جائے۔ ان حقائق سے منہ موڑنا اور اہمیت نہ دینا بہت بڑے عدم توازن اور ظلم کو جنم دیتا ہے۔

☆ تاریخ انسانی کی جنگیں، قتل و غارت اور تباہی اسی غلط سوچ پر اصرار کے نتیجے میں ہی انسانیت کا مقدر بنتی رہی ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ نے خود عذاب بھیج کر ظالم اور جابر حکمرانوں اور قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔

اس سطح پر لفظ ہدایت کا مفہوم سمجھنے کے لئے انسان اپنی زندگی میں اور گردش و پیش میں بکھرے ہوئے مزید چند حقائق کو سامنے رکھے۔

☆ پچیس تیس سال کا ایک صحت مند انسان جب اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ تو جسمانی اور دماغی لحاظ سے اپنے ماحول میں بہت نمایاں اور بھرپور صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ تاہم وہی انسان 20 سال بعد جب اپنے آپ کو دیکھتا

ہے یا اپنے جوانی کے خیالات کا جائزہ لیتا ہے۔تو اسے اپنی سابقہ سوچ اور مرغوبات میں کئی کمزوریاں خطائیں اور ناپختگی کی علامات نمایاں نظر آتی ہیں اور وہ بعض اوقات شرمندگی سی بھی محسوس کرتا ہے کہ میں یہ بھی سمجھتا تھا؟ اور کرتا تھا؟ اسی طرح ہر پانچ، دس سال پیچھے مڑ کر دیکھیں تو انسان اپنے اندر ایک طرح کی پختگی اور تکمیلی شان کی طرف بڑھنے کا احساس پاتا ہے۔

☆ اسی طرح انسان اپنے سے کم صلاحیتوں کے بعض لوگوں کو دیکھتا ہے اور بعض اپنے سے زیادہ باصلاحیت لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہے اسے واضح فرق نظر آتا ہے اور وہ ضرورت محسوس کرتا ہے۔کہ اپنے ماحول میں حتیٰ المقدور کمزوریوں، حماقتوں، بے وقوفیوں سے بچے اور قول و عمل اور فکر کی پختگی اور اصابت کو نہ صرف ظاہر کرے بلکہ اس کو حقیقتاً اختیار بھی کرے اور اس کی ضرورت کی اہمیت کے پیش نظر اس کو حاصل کرنے کے لئے بھرپور کوشش بھی کرے۔صلاحیتیں، اوقات اور پیسہ بھی لگانا پڑے تو لگائے۔ گویا اس ''شئے'' کے حصول کو وہ اپنی ضرورت محسوس کرنے لگتا ہے انسان اپنے سے کم صلاحیت کے لوگوں کو دیکھتا ہے یا ان کے کاموں کو دیکھتا ہے تو ان پر ہنستا ہے، تبصرے کرتا ہے بلکہ اپنی کامیابی اس کو سمجھتا ہے کہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔اور بعض لوگ دوسروں کی کمزوریوں سے نہ صرف فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ دوسروں کو جان بوجھ کر اندھیرے میں رکھ کر یا لاعلمی میں رکھ کر اپنا کام نکالتے ہیں دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

☆ بعض انسان اپنے ساتھ دوسرے کے رویوں کا شکوہ کرتے ہیں اور خود دوسروں کے ساتھ اسی طرح کا رویہ رکھتے ہیں۔گالیاں دینا، جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا ،کم تولنا، ملاوٹ کرنا، بے حیائی کے کام کرنا اسی نوعیت کے کام ہیں۔

☆ اس سارے عمل میں انسان چونکہ ایک باحیثیت، بااختیار ہے ۔اور دیگر مخلوقات میں ممتاز مقام کا حامل ہے لہٰذا انسان کے اس رویّے سے انسان تو ڈسے ہی جاتے ہیں جانور اور دوسری کمزور مخلوقات بھی محفوظ نہیں رہ پاتیں

☆ انسانوں میں بعض ایسے انسان بھی ہوتے ہیں۔جنہیں کسی ایسی کمزوری پر توجہ دلائی جائے تو وہ سنبھل جاتے ہیں شکریہ ادا کرتے ہیں ۔آئندہ اچھے انسان بننے کا ارادہ کرتے ہیں۔اوران میں خاصی تعداد میں لوگ عملی زندگی میں ''اچھے انسان'' بننے میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں ایسے انسان ہی انسانی معاشرے کا حسن ہیں۔

☆ جبکہ بعض انسان ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کسی کمزوری پر توجہ دلائی جائے تو ناراض ہوتے ہیں اور شرمندگی کی بجائے ڈھٹائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اصلاح کی طرف مائل نہیں ہوتے ایسے انسان، انسان ہوتے ہوئے بھی دیگر انسانی برادری کے نقصان پر آمادہ رہتے ہیں۔اور دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود آرام کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔

☆ کم تعداد میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس قدر بگڑ جاتے ہیں جو اصلاح کی بات کرنے والے پر الٹا چڑھائی کر دیتے ہیں ۔کہ یہ صلاحیتیں ہمیں ملی ہیں اور ہمیں ان سے بھرپور فائدہ حاصل کرنا چاہئے اور دوسروں کا نقصان ہوتا ہے تو ہو۔کمزور اور کم صلاحیتوں والے انسان پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ ان کو استعمال کیا جائے بلکہ بعض لوگ تو اخلاقی قدروں کا انکار کرتے ہیں۔اوران کو فرسودہ سمجھتے ہیں ان کے خیال میں باصلاحیت لوگ ہی صرف انسان ہیں باقی لوگ تو ''جانور'' اور حیوان ہیں اور انسان کو جو دل میں آئے وہ کرنا چاہئے اور دوسروں کو نصیحتیں کرنا اور سمجھانا اور اخلاقی اصول بتانا یہ سب فضول باتیں ہیں۔انسان اس دنیا میں آیا ہے اور اس کو پیدا کرنیوالے نے عقل دی ہے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔لہٰذا اس عقل پر مزید کسی اخلاقی اور

خارجی پابندی اور ضابطے کی ضرورت نہیں ہے جو سمجھ میں آئے کرو ہر چیز جائز ہے اور ہر کام ٹھیک ہے بات ہاتھ پڑنے کی ہے جہاں ہاتھ پڑے وہ کام کر دو اور جو دل میں آئے وہ کر گزرو۔

آیئے دیکھیں ____ اس سطح پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیا مقام دیا ہے اور کس طرح ہدایت بخشی ہے۔

(1) اللہ تعالیٰ اس سطح پر انسان کو دوسرے بنی نوع انسان کی خدمت اور ہمدردی کی ہدایت دی ہے۔ چنانچہ فرمایا!

الم نجعل له عينين و لسانا و شفتين و هدينٰه النجدين (البلد)

ترجمہ: ''بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیئے) اور اس کو (خیر و شر کے) دو رستے بھی دکھا دیئے''

اور اس ''ہدایت'' کا مطلوب نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان نری حیوانیت سے ذرا بلند ہو کر انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کی راہ اختیار کرے اور اپنے گرد و پیش میں دونوں آنکھوں کو استعمال میں لا کر دیکھے اور احتیاج، فقر اور جبر کے خلاف ہونٹ اور زبان استعمال کرے یعنی اظہار خیال کرے اور کراہت اور ناپسندیدگی کا اظہار کرے اور خود حتی المقدور دوسروں کی خدمت میں لگ جائے۔ اگرچہ انسانوں کی عظیم اکثریت اس مرحلہ سے کامیاب ہو کر نہیں نکلتی فرمایا!

فلا اقتحم العقبة وما ادرٰك ماالعقبة فك رقبة اواطعام فى يوم ذى مسغبة يتيما ذامقربة او مسكينا ذامتربة (البلد)

ترجمہ: ''مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔ اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی (کی) گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا یتیم رشتہ دار کو یا فقیر خاکسار کو''

یا فرمایا!

فذٰلك الذى يدع اليتيم ولا يحض على طعام المسكين (الماعون)۔

ترجمہ: ''یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کیلئے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا''۔

نیز انسانی ہمدردی سے عاری اس روش کو گمراہی اور ضلالت قرار دیا۔

فویل للمصلین الذین هم عن صلاتهم ساهون الذین
هم یراء ون ویمنعون الماعون۔(الماعون)

ترجمہ: ''تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے۔ جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں عاریت نہیں دیتے''۔

گویا ذاتی سطح پر عبادت رب کا اہتمام کر کے وہ جس اگلے مرحلے کے مستحق قرار پانے والے تھے انسانی ہمدردی سے تہی دست و تہی دامن ہونے کی وجہ سے وہ انسانیت کے مقام پر بھی رہنے کے قابل نہیں کجا کہ وہ بلند مرتبے کے حامل بنیں گویا جب ہم اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے مراد ارکان صلوٰۃ کی صحیح ادائیگی، وضو اور غسل کے واجبات و سنن کے اہتمام کے ساتھ زیادہ اہم خدمت خلق اور انسانی ہمدردی کے جذبہ کی موجودگی ہے اور یہ ہدایت کا حصہ ہے۔

(2) فطرت سلیم اور عقل سلیم کے ساتھ انسان اگر پہلے مرحلے سے گزر رہا ہے یا اس کو پہچان چکا ہے تو دوسرا مرحلہ جو درپیش ہوگا اور انسان اس کا تجربہ کرے گا وہ ہے ایک اخلاقی حِس جسے اردو میں ضمیر کہتے ہیں۔ انگریزی میں Morality یا Moral Law کہتے ہیں کہیں Innervoice کہا گیا ہے قرآن مجید میں نفس لوّامہ سے موسوم ہے اور اس کا تعلق روح کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ''روح'' بھی کہا گیا یا خودی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

اس اخلاقی حِس کے اثرات ہمارے مادی وجود یعنی جسم پر پڑتے ہیں۔ انسانی رویہ اس کے تابع ہوتا ہے اگر اخلاقی حس کے اثرات گہرے ہیں تو ہمارے رویّے مثبت ہوں گے اور خدمت خلق اور انسانی ہمدردی کی فکر دامن گیر ہوگی اور اگر یہ اثرات سطحی اور نہ ہونے کے برابر ہیں تو اس شخص کی زندگی اخلاقیات (Moralty) سے خالی ہوگی۔ یہی رویّے اور اخلاق بتائیں گے کہ انسان کس حد تک سنور گیا ہے یا ''بگڑ'' گیا ہے۔ یہی کیفیت بڑھتے بڑھتے ''ظاہر و باطن کا

تضاد'' اور ''قول وفعل کا تضاد'' بن کر سامنے آتی ہے اور انسان اپنے ضمیر کے خلاف اور روحانی تقاضوں کے خلاف چل کھڑا ہوتا ہے۔

انسان کا ضمیر ان باطنی کیفیات پر لحمہ بہ لحمہ انسان کو مطلع کرتا رہتا ہے انسان Gullty Conscions محسوس کرتا ہے اور یہ تمام انسان کا باطنی تجربہ ہے کہ ہمارے ساتھ بار بار ایسا ہوتا ہے۔

لفظ ''نور'' کی گزشتہ بحث میں یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے روح ایک نورانی وجود ہے ''نور'' کے لفظ کی ساری بحث روح کی کیفیات اور اس کے اثرات کے بارے میں تھی اور لفظ نور کے مختلف استعمالات حقیقتاً اور مجازاً ان کیفیات کو ظاہر کر رہے تھے جبکہ ''ہدایت'' کے لفظ کا تعلق بنیادی طور جسم کے ساتھ ہے جس میں انسان کے ظاہری حواس، عقل سلیم، تعقل فواد اور نفسیات کی زبان میں ساری جبلتیں سموئی ہوئی ہیں شعور اور تحت الشعور کے سارے درجے اور لاشعور کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے تحت شمار کیا جا سکتا ہے گویا فی الواقع ہدایت یافتہ انسان وہ ہے جو روح کی پاکیزگی و بالیدگی کا بھی لحاظ کرتا ہے اور اس کا مادی وجود بھی عام طور پر اس کی روح کے زیر اثر ہی اپنا کام سرانجام دیتا ہے اگر کبھی کبھی تضاد سامنے آتا ہے تو انسان شعوری طور پر ناپسندیدگی کا اظہار کرے اور رجوع کا احساس پیدا کرے یہی مطلوب کیفیت ہے۔ یہ احساسات کی دنیا کی بات ہے اور نہایت غور طلب ہے جو اس راہ پر چل کر گزر آیا ہے یا گزر رہا ہے اس کی آپ بیتی ہے اور جو اس کا مسافر نہیں ہے اس کے لئے ناقابل فہم۔

اس مرحلے پر رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا لفظ کثرت سے استعمال فرمایا ہے چنانچہ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کے جنت میں ایک ''حکم کی خلاف ورزی'' ہونے کے موقع پر فرمایا!

و عصیٰ آدم ربه فغویٰ۔

ترجمہ: ''آدم نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو وہ (اپنے مطلوب

سے) بے راہ ہو گئے''۔

ثم اجتبٰہ ربہ فتاب علیہ و ھدی۔(طٰہٰ 122)

ترجمہ: ''پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی بتلائی''۔

انسان نے اپنے رب کی نافرمانی کی اللہ تعالیٰ نے عاجزی کو دیکھ کر پسند فرمالیا اور توبہ قبول فرما کر ہدایت بخش دی۔

جناب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں فرمایا!

ووجد ك ضالا فھدی (الضحیٰ)

ترجمہ: ''ہم نے آپ کو ہدایت کے لئے سرگرداں پایا پھر ہدایت دے دی''۔

جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آغاز وحی سے پہلے چھ صدیوں سے دنیا میں کوئی نبی علیہ السلام نہیں آیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں تحریف کر کے تثلیث میں بدل دیا گیا تھا اور انجیل غائب کر دی گئی تھی دنیا میں ہدایت کا سامان موجود نہیں تھا۔ جناب رسول اللہ ﷺ اپنی اعلیٰ خلقت اور مقام و مرتبہ کے لحاظ سے تھے تو حق پر اور عین راہ مستقیم پر مگر وہ ہدایت واضح نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے وحی بھیج کر اور قرآن دے کر آپ ہی کے راستے کو صراط مستقیم اور عین ہدایت قرار دے دیا۔

ہدایت کا عمل کئی مراحل کا مجموعہ ہے انگریزی میں ہدایت کے لئے Guidance کا لفظ آتا ہے۔ پہلے مرحلے میں ہدایت راستے کا بجھانا اور سمجھانا ہے جبکہ دوسرے مرحلے میں انسان کو بشری تقاضوں کے باوصف اس ہدایت کے مطابق ڈھال کر عین سیدھے راستے پر چلا دینا ہے تا کہ دوسرے بھی دیکھیں اور خود انسان بھی اپنی پیش رفت کو دیکھ سکے۔ اور تیسرا مرحلہ منزل پر حقیقتاً پہنچا دینا ہے۔ یہ ہدایت تامہ کا مرحلہ ہے۔

ہدایت کے اسباب میں سے سلسلہ نبوت و رسالت کا جاری کرنا اللہ تعالیٰ کی خاص

شان رحمت کا مظہر ہے اور اس کا ختم ہونا (مکمل ہونا) بھی مزید شان رحمت کا مظہر ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرے میں ان کے زمین پر تشریف آوری کے ساتھ ہی ذکر ہے ۔فرمایا!

فامایا تینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون۔(البقرہ38)

ترجمہ: ''جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا۔ نہ وہ غمناک ہونگے''۔

یہی ہدایت ''ذکر'' اور یاددہانی اور نصیحت بھی کہلاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں اس پس منظر میں فرمایا!

ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا۔(طٰہٰ 124)

ترجمہ: ''جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا اس کی زندگی تنگ ہوجائیگی''۔

آسمانی ہدایت کی مختلف شکلیں، آسمانی صحیفے اور چار مشہور کتابیں ہیں چنانچہ فرمایا! سورۃ الاعلیٰ میں ہدایت کے تذکرے کے بعد کہ ایسی ہی ہدایت۔

ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم و موسیٰ

''یہی بات پہلے صحیفوں میں (مرقوم) ہے یعنی ابراھیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں''

یہی بات تورات کے بارے میں فرمائی!

انا انزلنا التورٰۃ فیھا ھدی و نور (المائدہ44)

ترجمہ: ''بیشک ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی تھی''۔

ایسے ہی الفاظ انجیل کے بارے میں وارد ہوئے۔

واتینٰہ الانجیل فیہ ھدی و نور (المائدہ46)

ترجمہ: ''اور ان (حضرت عیسیٰؑ) کو انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور ہے''۔

عین اسی طرح کے الفاظ بلکہ زیادہ شاندار اور پرزور الفاظ قرآن مجید میں آتے ہیں۔

ذٰلك الكتاب لا ريب فيه هدى للمتقين

ترجمہ: ''یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں شک نہیں (کہ کلامِ خدا ہے) خدا سے ڈرنے والوں کی رہنمائی ہے''۔

كتاب انزلنا ه اليك مبٰرك ليدبروا ايته و ليتذكر اولوا الالباب۔(ص29)

ترجمہ: ''یہ کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آئیتوں میں غور کریں تاکہ اہل عقل نصیحت پکڑیں''۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور اس تک رسائی کی توفیق بھی اس ہدایت کا حصہ ہے فرمایا! ان هدى الله هو الهدى۔

ترجمہ: ''خدا کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے''۔

اس آسمانی ہدایت کو جب ہدایت اور قرآن مجید کو الہدیٰ (مکمل ہدایت یا آخری ہدایت یا کامل ترین ہدایت قرار دیا گیا تو درجہ بدرجہ مجازاً اس ہدایت کے لانے والے مہبط وحی پیغمبروں کو بھی ہادی اور وہ ایام اور اوقات اور مواقع جن میں اہم ہدایت اتری وہ بھی اہم قرار پائے اور تاریخی اہمیت اختیار کر گئے۔

چنانچہ فرمایا!

انا انزلناه فی ليلة القدر و ما ادرٰك ما ليلة القدر ليلة القدر خير من الف شهر ۔

ترجمہ: ''ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے''۔

شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن هدى للناس و بينٰت من الهدى والفرقان۔(بقرہ 185)

ترجمہ: ''رمضان کا مہینہ ہے۔جس میں قرآن (اوّل اوّل) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں۔اور جو حق و باطل کو الگ الگ کرنے والا ہے''۔

هدی للمتقین اور هدی للناس
اور اس کی وضاحت

قرآن کے ہر قاری کے سامنے یہاں عام طور ایک اشکال سامنے آتا ہے کہ متقی تو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہوتے ہیں قرآن مجید صرف ان کے لئے کیوں ہے حالانکہ اس کتاب کو ہدایت تو دوسروں کیلئے ہونا چاہئے تھا اس اشکال کو بآسانی دور کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید اپنی اصل قوت استدلال اور مبنی برحق ہونے کی بنا پر تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا سامان رکھتا ہے انسان مشرق کا ہو یا مغرب کا، کالا ہو یا گورا، کسی قومیت اور برادری سے تعلق رکھتا ہو۔اور کوئی سی زبان بولنے والا ہو مرد ہو یا عورت ہو جو انسان کوشش کرے اور متلاشی اور سائل بن کر آئے تو قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی ہادی نہیں مگر عملاً جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس قرآن سے ہدایت حاصل کرنے میں کامیاب صرف وہی لوگ ہوں گے جو متقی ہیں تقویٰ کے معنیٰ پرہیزگاری کے ہیں۔اور قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنا بہت مشابہ ہے کسی حکیم یا ڈاکٹر کے نسخے سے ظاہری بیماری سے شفا حاصل کرنے کے۔

حکیم یا ڈاکٹر کے ہر نسخے کے ساتھ ایک ''پرہیز'' ہوتا ہے اگر کوئی شخص دوائی تو استعمال میں لائے مگر حکیم/ڈاکٹر کا بتایا ہوا پرہیز نہ کرے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ شفاء کی امید نہیں ہے اسی طرح قرآن کتاب ہدایت ہے اور تمام بنی نوع انسانی کے لئے روحانی بیماریوں اور گمراہیوں کے لئے شفاء بن کر آیا ہے مگر اس سے استفادے کے لئے ایک پرہیز ہے یعنی جھوٹ، بددیانتی اور اسی قسم کے رذائل اخلاق اور Social Evils سے پرہیز اسی کا نام تقویٰ ہے اور ضمیر ہے اور تقویٰ کے معنی پرہیزگاری ہی کے کئے جاتے ہیں یعنی جو شخص قرآن مجید کے الہدیٰ ہونے سے استفادہ کرنا چاہے اسے قرآن کا بتایا ہوا پرہیز کرنا ہوگا۔بنیادی طور پر ضمیر کے مطابق زندگی گزارنا ہوگی یہ

فطرت انسانی ہے گویا عملاً قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے میں صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اس کا بتایا ہوا پرہیز کرتے ہیں جن کے اندر کا انسان زندہ ہے اور جو ضمیر کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں یا اس کا عزم رکھتے ہیں۔

ایسے خوش نصیب انسان جو قرآن سے ہدایت پالیں ان کے لئے قرآن مجید میں باب افتعال سے اھتدی اور مھتد کا لفظ آیا ہے یا مفلح کا لفظ آیا ہے۔

اہل ایمان کا تذکرہ کر کے فرمایا!

اولئك علیٰ ھدیً من ربھم واولئك ھم المفلحون۔

ترجمہ: ''یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں''۔

و بشر الصٰبرین الذین اذا اصابتھم مصیبة قالواا نا لله وانا الیه راجعون اولٰئك علیھم صلوٰت من ربھم و رحمة و اولٰئك ھم المھتدون۔(بقرہ157)

ترجمہ: ''اور صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں۔ کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے رستے پر ہیں''۔

انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں تشریف لانا، وحی کا نزول، کتابوں کا اتارنا یہ سب انتظام لوگوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا! اب محنت کرنا، جدوجہد کرنا، اور سعی کر کے اور تقویٰ کی روش پر چل کر اس ہدایت کو پالینا اور ہمت کر کے اس راہ کی مشکلات کے باوجود اس پر چل نکلنا یہ انسان کا کام ہے اللہ تعالیٰ مشکلات آسان کر دیتا ہے۔

فرمایا!

والذین جا ھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔(عنکبوت69)

ترجمہ: ''اور جن لوگوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے رستے دکھادیں گے''۔

فاما من اعطی واتقی و صدق بالحسنی فسنیسرہ للیسریٰ (اللیل)۔

ترجمہ: ''تو جس نے (خدا کے رستے میں مال) دیا اور پرہیزگاری کی اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دینگے''۔

اوپر جتنی تفصیل بیان ہوئی ہے اس میں ایک بات ظاہر ہے کہ ہدایت کے اسباب اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیئے ہیں اور (اب قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ موجود ہے) مگر اس سے استفادہ کرنا ہمارا کام ہے۔ ہدایت کا نصیب ہونا یا ہدایت سے محرومی کا معاملہ چونکہ اصلاً انسان کی باطنی کیفیات، تقویٰ کی حالت، ضمیر کی کیفیت، انسان کی نیت، ارادہ، وغیرہ سے مشروط ہے لہٰذا آخری درجے میں بات انسان کے باطن اور اللہ کے درمیان راز کی سی کیفیت ہے دوسرا انسان صرف ظاہر کو دیکھ کر کسی کی تڑپ اور چاہت اور جدوجہد کا اندازہ کرسکتا ہے مگر ہم نیت نہیں دیکھ سکتے ہیں اسی لئے بعض اوقات ہم چاہتے ہیں کہ کسی خاص شخص کو ہدایت مل جائے مگر اس کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی باطنی کیفیات سے واقف اور ہم نہیں جانتے۔ کہ وہ ہدایت کے حصول میں مخلص بھی ہے یا نہیں اللہ تعالیٰ نے اس کی نیت کے خلوص سے بدرجہ اتم واقف ہیں لہٰذا آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے کہ کسی شخص کو ہدایت نصیب ہوگی یا نہیں ہم تو صرف یہ مشاہدہ کریں گے کہ ہدایت مل گئی تو اس نے خلوص نیت کی اور ہدایت پالی اور ہدایت نہیں ملی تو اس کی کوشش اور نیت میں کوئی کمی یا خدانخواستہ فتور تھا تبھی راہ یاب نہیں ہو سکا۔ (اعاذ نا اللہ من ذٰلك) چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا!

انك لاتھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء۔

ترجمہ: ''(اے محمدؐ) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے''۔

انسان کی باطنی کیفیات کا حتمی علم اور ہدایت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا ہے لہٰذا ہدایت کے حصول کے لئے لوگوں کے سامنے خدا ترسی اور تقویٰ کی کیفیات ظاہر کرنے کی بجائے صرف اللہ کو دکھانے کے لئے خلوص اور اخلاص کا سرمایہ درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو خلوص و اخلاص کی دولت عطا فرمائے اور ہمارے نصیب میں ہدایت لکھ دے۔

آخری بات یہ ہے کہ انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں اور خرد کی گتھیوں کے معاملات ایسے ہیں کہ انسانی خیالات ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں اور تغیر پذیر رہتے ہیں۔ لہٰذا ہدایت کامل جانا یا پالینا ایک مرحلہ ہے چاہے مشکل سہی مگر اس ہدایت پر قائم رہنا اور دوام اور اس کے تقاضے پورے کرنا پہلے مرحلے سے کہیں زیادہ مشکل ہے اس لئے کہ انسانی شعور کہیں آ کر ٹھہراؤ نہیں کرتا وہ آگے سے آگے اور نئی سے نئی باتیں اور نئے سے نئے خیالات کے پیچھے رہتا ہے اور ہر نئے مشاہدے کے ساتھ خیالات کے بدلنے کا امکان رہتا ہے۔ لہٰذا اس ہدایت کے حصول کے بعد بھی اللہ تعالیٰ سے مسلسل ہدایت کا طلبگار رہنا اور ہر نئے موڑ اور ہر نئے لمحے پر ہدایت کے لئے سوال کرتے رہنا ہی ہمارا ہدایت یافتہ ہونا ہے یہی وجہ ہے کہ پانچ نمازوں کی معروف رکعتیں 48 ہیں اور ہر رکعت میں (مقتدی پڑھے یا امام) 48 دفعہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا لازم ہے اور 48 مرتبہ ہی اھدنا الصراط المستقیم کا تکرار لازم ہے اور یہ انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ اعلیٰ درجے کے انسانوں کے لئے ذرا سی غفلت بھی وبال جان و ایمان ہوتی ہے اور یقیناً درجے کے فرق کے ساتھ کیفیات کا بھی فرق ہوتا ہے۔

حسنات الابرار سیئات المقربین۔

میرے جیسے آدمی کو فرض کی چار رکعتوں میں چار سیکنڈ بھی خلوص سے اللہ تعالیٰ کی حضوری نصیب ہو جائے تو بڑی بات ہے مگر اولیاء کرامؒ اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین درجہ بدرجہ شاید پہلے اعلیٰ مقام پر ہیں انبیاء کے لئے شاید پوری نماز میں ایک ''لمحے'' کی غفلت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بن جائے۔ اسی لئے حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی کی تمام نمازوں سمیت آخری نماز کی آخری رکعت میں بھی سورۃ فاتحہ ہی کا تکرار کیا تھا اور حضرت محمد ﷺ نے بھی اپنی آخری نماز

میں سورۃ فاتحہ ہی کی تلاوت فرمائی تھی۔

ہدایت کا پالینا اور پھر اس میں ترقی کے ساتھ سنبھال کر چلتے رہنا اسی بات کا متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مسلسل اور تکرار کے ساتھ سفر زندگی کے ہر موڑ اور ہر زینے پر اور عمل کے میدان میں ہر دوراہے پر ہدایت ہی کا طلب رہا جائے اور اللہ کی یاد اور اس کے سامنے عاجزی کے احساس کے ساتھ بندگی میں زیادہ سے زیادہ ساعتیں گزار دی جائیں یہی عین ہدایت ہے۔

اسی درجہ میں ہدایت کا آخری مظہر اور دعا وہ ہے جو قرآن پاک میں خود خالق ارض وسما نے سکھائی اور بتائی ہے کہ اہل جنت، جنت میں پہنچ کر جو دعا کریں گے وہ اس آخری درجے میں ہدایت کے حصول کے شکرانے کی ہوگی اور وہ درجہ ہوگا آخری درجہ۔

فرمایا! (اہل جنت کی دعا)

الحمد لله الذی هدانا لهذا وما کنا لنهتدی لولا ان هدانا الله۔(اعراف43)

ترجمہ: ''خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں کا رستہ دکھایا اور اگر ہم کو رستہ نہ دکھاتا تو ہم رستہ نہ پا سکتے۔''

اللھم۔ ''الٰہی''

اھدناالصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم والضالین۔

ترجمہ: ''ہم کو سیدھے رستے چلا ان لوگوں کے رستے جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا اور نہ گمراہوں کے''۔

جو جانتا ہے وہ جانتا ہے
جو نہیں جانتا وہ جان لے

راقم کے قریبی لوگ اور احباب تو ہی جانتے ہیں، حال ہی میں حکمتِ بالغہ کے ذریعے ایک نئے اور وسیع حلقے میں تعارف ہوا ہے۔ تو ان کی اطلاع کے لئے ذیل کی سطور شائع کی جا رہی ہیں، تا کہ حقیقتِ حال واضح رہے اور سند رہے۔

''انجینئر مختار حسین فاروقی'' کے نام میں فاروقی کا لفظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اولاد ہونے کے ناطے سے نہیں ہے بلکہ عقیدتاً اور ان کے عہد خلافت میں جاگیرداری کے خاتمے، عدل اجتماعی کے اعلیٰ انتظامات اور مساوات انسانی کے شاندار کارناموں کی وجہ سے ہے۔

ذاتی طور پر میرا تعلق والد کی طرف سے کھوکھر فیملی سے ہے اور والدہ کی طرف سے کھرل فیملی سے ہے، آباء واجداد غالباً ڈیڑھ سو سال پہلے شاہ پور وغیرہ کے علاقہ سے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔

والد صاحب کی طرف سے شجرۂ نسب کا ریکارڈ یہ ہے

مختار فاروقی ولد میاں لال دین ولد میاں امام بخش ولد میاں ہدایت اللہ
ولد میاں نور محمد ولد میاں سکندر ولد میاں بہاب (عبدالوہاب) کھوکھر۔

والدہ کی طرف سے شجرۂ نسب کا ریکارڈ یہ ہے

مختار حسین فاروقی بیٹا جنت بی بی ولد حافظ احمد ولد میاں فتح محمد ولد میاں احمد
ولد میاں سلطان قوم کھرل

یہ بات اس ضمن میں کسی غلط فہمی سے بچنے اور نسب میں تبدیلی کے شائبے سے بچنے کے لئے شائع کی جا رہی ہے

منجانب: انجینئر مختار فاروقی

علامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

خطبۂ مسنونہ اور دعا کے بعد:

صدر گرامی قدر، مہمان گرامی، محترم پرنسپل صاحب، اساتذہ اور عزیز طلبہ:

اگرچہ پاکستان کی اس مشہور درس گاہ میں اس سے قبل متعدد بار خطاب کا موقع مل چکا ہے تاہم مجھے شدت سے احساس ہے کہ آج کے اس اجلاس سے جو بیادِ علاّمہ اقبال مرحوم منعقد ہو رہا ہے، میرا خطاب کرنا ایک غیر معمولی جرات ہی نہیں کسی قدر نامناسب جسارت بھی ہے۔

اس کا سبب بالکل واضح ہے یعنی یہ کہ میں نہ زبان و ادب کے میدان کا آدمی ہوں نہ فکر و فلسفے کا، بلکہ میری بنیادی تعلیم سائنس کی ہے اور ثانوی تربیت طبّ و علاج کی۔ جبکہ علامہ اقبال کی دو سب سے زیادہ معروف حیثیتیں یہی ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے شاعر بھی ہیں اور ایک عظیم فلسفی اور مفکّر بھی۔ لہٰذا علامہ مرحوم کے بارے میں میری تقریر کچھ اَنمل بے جوڑ سی بات ہے۔ بایں ہمہ جب مجھے اس تقریب میں حاضر ہو کر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو میں نے بغیر کسی پس و پیش یا ردّ و قدح کے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان، قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے اور بالکل اَن پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل، علامہ مرحوم کے ساتھ سہ گانہ و سہ گونہ رشتوں میں منسلک ہے

ایک یہ کہ یہ مملکتِ خداداد سرزمینِ پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اقامت گزیں ہیں، اس کا وجود و قیام علامہ مرحوم ہی کے تخیّل و تصور کا رہینِ منّت ہے۔۔۔ دوسرے یہ کہ وہ عالمی ملّتِ اسلامی اور امت مرحومہ جس سے ہم سب منسلک

ہیں،اس دور میں اس کی عظمت وسطوتِ پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں بھی اقبال ہے اور اس کے احیاء ونشاۃِ ثانیہ کا سب سے بڑا حُدی خواں بھی اقبال ہی ہے۔۔۔۔تیسرے یہ کہ وہ دین حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اور جس کے بارے میں کچھ ہی پہلے حالؔی مرحوم نے کہا تھا:۔

جودن بڑی شان سے نکلا تھاوطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

اس دور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے اسرار ورموز کا سب سے بڑا راز دان بھی اقبال ہی ہے اور اس کی روح باطنی اور جسد ظاہری دونوں کے تجدید واحیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اقبال کو ہی حاصل ہے۔

یہ سہ گانہ تعلق تو علامہ مرحوم کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے، مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روحِ اقبال سے یہ ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے یہ حقیقت مجھ پر شدت کے ساتھ منکشف ہوچکی ہے کہ احیاء اسلام کی شرط لازم تجدید ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔گویا ملت اسلامی کی نشأۃِ ثانیہ اور تشکیل جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبہء دینِ حق کی جدّ وجہد دونوں کا اصل منبع ومدار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم کے ساتھ صحیح تعلق دوبارہ استوار کیا جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی کوشش کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہئے اور میں دیکھتا ہوں کہ ملتِ اسلامی اور دینِ حق دونوں کے احیاء اور نشأۃ ثانیہ کے اس طرح قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس اسی قدر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ علامہ مرحوم کو تھا۔یغفر اللّٰہ لہ ویرحمہ۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ---میں نہ علامہ مرحوم کی شاعری اور ان کی فصاحت وبلاغت یا قدرتِ کلام کے بارے میں کسی ماہر فن ناقد کی حیثیت سے کچھ عرض کرنے کا مجاز ہوں--نہ ان کے فکر وفلسفے پر خالص فلسفیانہ انداز میں کوئی تبصرہ کرسکتا ہوں--بلکہ میں مذکورہ بالا چار نسبتوں ہی کے بارے میں کچھ مختصر عرض کروں گا۔

(1) مصوّرِ پاکستان

سب جانتے ہیں علامہ مرحوم بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے، بلکہ انتہائی کوشش کے

باوجود وہ اپنے مزاج کو عملی سیاست کے ساتھ ساز گار نہ بنا سکے۔اس کے باوجود انہوں نے برّصغیر ہندو پاک کی مسلمان قوم کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی اور معاملہ فہمی بلکہ کہنا چاہئے کہ سیاسی تدبر کا شاہکار ہے۔ 30ء سے قبل تو سوال ہی کیا پیدا ہوسکتا ہے، اس کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ صرف علامہ مرحوم ہی کی نگاہ دوررس و دور بیں تھی جس نے حالات کے رخ اور زمانے کی رفتار کو پہچان کر مسلمانان ہند کے جملہ مسائل کا حل اسے قرار دیا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم کی جائے۔

آبِ روان کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

پاکستان کے ساتھ علامہ کا تعلق صرف ''مصوّر'' کا نہیں، بلکہ اس سے زیادہ ہے۔وہ اگرچہ خود عملی سیاست کے مرد میدان نہیں تھے، تاہم حالات کے صحیح نبّاض اور ان کی سیاسی بصیرت کا دوسرا شاہکار یہ ہے کہ انہوں نے موجود الوقت حالات میں مسلمانان ہند کے قومی مقدمے کی پیروی کے لیے صحیح ترین 'وکیل' ڈھونڈ نکالا اور نہ صرف یہ کہ ان کی نگاہ دوررس نے مسلمانان ہند کی قیادت عظمیٰ کے لئے محمد علی جناح مرحوم کو تاکا بلکہ خود ان میں اپنی اس حیثیت کا احساس اجاگر کیا۔ اور یہ تو بلاشبہ علامہ مرحوم کے غایت خلوص و اخلاص کا بیّن ثبوت اور ان کے حد درجہ انکسار اور تواضع کی دلیل قاطع ہے کہ انہوں نے اس قائد کے ساتھ اس کی تنظیم کے ایک صوبائی صدر کی حیثیت سے کام کرنا بھی منظور کر لیا حالانکہ ان کے مزاج کو اس قسم کے کاموں کے ساتھ کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔اس طرح علامہ مرحوم نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کا تصور پیش کیا بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی جدّ وجہد کے ابتدائی مراحل میں بنفس نفیس شرکت بھی کی اور گویا ''تحریک پاکستان'' کے کارکنوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

اس اعتبار سے علامہ مرحوم کا ایک عظیم احسان ہر اس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے۔افسوس کی ہم نے بحیثیت

قوم خود پاکستان ہی کی قدر نہ کی ،علامہ کے اس احسان کو کیا یاد رکھتے ۔کاش کہ لوگوں کو معلوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالی کی کتنی بڑی نعمت ہے اور مملکت خداداد پاکستان اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے ۔اسی صورت میں ہمیں علامہ مرحوم کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہوسکتا تھا۔

ہماری اس ناقدری کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کا ایک بازو نہ صرف کٹ کر علیحدہ ہوگیا بلکہ کم ازکم فوری طور پر اس کی کامل قلبِ ماہیت بھی ہوگئی اور اس نے ایک اسلامی یا اس سے بھی کمتر درجے میں ایک مسلمان مملکت کے بجائے ایک لادینی ،قومی ،سوشلسٹ ریاست کا روپ دھارلیا۔ اس حادثہ فاجعہ پر بھارت میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح ''ہزار سالہ شکست کے انتقام'' سے تعبیر کیا گیا اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی حسنِ ظن میں مبتلا تھے ۔اگر مسز اندرا گاندی اس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے، یہ الفاظ زبان سے نکال سکتی ہے تو ''قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا'' کے مصداق سوچنے کی بات ہے فرقہ پرست متعصب مزاج ہندو اکثریت کا رویہ، اگر اسے ایک بار ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہوجاتا ،تو کیا ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اب تک ہندوستان سے اسلام کا صفایا ہو چکا ہوتا بلکہ پورا مشرق وسطیٰ ہندو امپیریلزم کے سیلاب کی زد میں ہوتا۔

علامہ مرحوم نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں فرمایا تھا:۔

وہ ہند میں سرمایہ ء ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

تو اگرچہ شخصاً تو علامہ مرحوم کا کوئی مقابلہ یا موازنہ حضرت مجددؒ کے ساتھ خارج از بحث ہے ،تاہم اگر یہ کہا جائے کہ خاص طور پر ''ہند میں سرمایہ ملت کی نگہبانی'' کے اعتبار سے علامہ مرحوم کو ایک نسبت خصوصی حضرت مجددؒ کے ساتھ حاصل تھی یا یہ کہ علامہ مرحوم کی شخصیت کا یہ پہلو حضرت مجددؒ کے ساتھ ان کی والہانہ محبت اور عقیدت ہی کا مظہر ہے تو غالباً یہ غلط نہ ہوگا۔

(2) قافلہءِ ملّی کا حدی خواں

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کے پیش نظر یہ بات بڑی ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان ہند کے قومی مسائل کا ذکر علامہ مرحوم کے اشعار میں کہیں موجود نہیں ہے اور اپنے اشعار میں وہ عالمی ملت اسلامیہ کے نقیب اور قافلہ ملی کے حدی خواں نظر آتے ہیں۔

علامہ مرحوم کی شاعری کے دور اوّل میں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نہ صرف یہ کہ ان کا جذبہء حب الوطنی چھلکا پڑتا ہے بلکہ باقاعدہ ہندی قوم پرستی کے آثار بھی ملتے ہیں۔ لیکن ''بانگ درا'' ہی کے نصف آخر میں دفعتہً وہ عالمی ملت اسلامیہ کے ترجمان وحدی خواں کی حیثیت سے نمودار ہو جاتے ہیں اور ''ہندی ہیں ہم ہندوستاں ہمارا'' اور ''میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے'' کی جگہ ''چین وعرب ہمارا ہندوستان ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کا وجد آفریں ترانہ ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین ہندوستان کے مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کا مسئلہ جو ان کے سیاسی فکر کا مرکز ومحور ہے، ان کے اشعار میں کہیں نظر نہیں آتا

میرے نزدیک یہ تصور پسند (IDEALISM) اور حقیقت بینی (REALISM) کا حسین ترین امتزاج ہے جس سے ہمیں علامہ مرحوم کی شخصیت متصف نظر آتی ہے یا یوں کہہ لیں کہ یہ ''اَصلُهَا ثَابِتٌ'' اور فَرعُهَا فِي السَّمَاءِ'' (1) کی عمدہ مثال ہے کہ ایک جانب فکر اور خیال انتہائی بلندیوں کو چھو رہے ہوں اور دوسری طرف انسان کا تعلق اپنے نزدیکی ماحول کے تلخ

---

(1) سورۃ ابراہیم کی ایک تمثیل سے ماخوذ: ترجمہ ''اس کی جڑ جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں''

حقائق سے بھی منقطع نہ ہونے پائے۔

علامہ مرحوم کی ملی شاعری میں، جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا تھا، دونوں رنگ موجود ہیں، مرثیہ خوانی کا بھی اور حدی خوانی کا بھی ـــــ پہلے اعتبار سے یوں سمجھیے کہ انہوں نے شبلی وحالی دونوں کی جانشینی کا فرض ادا کیا اور ملت اسلامیہ کے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد سے بھی دلوں کو گداز کیا اور امت مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ بھی نہایت موثر اور دلدوز انداز میں کھینچا۔ مثال کے طور پر حالی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے

امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اور پھر پڑھیے وہ نظم جو ''صقلیہ'' (جزیرۂ سسلی) پر علامہ مرحوم نے کہی اور اندازہ کیجئے اقبال کی ملی مرثیہ خوانی کا!

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار!
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار!
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصر کہن کو جن کی تیغ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورش قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر تو ہّم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

یا پڑھیے ''بانگ درا'' میں اس کے قریب ہی کی وہ نظم جو ''بلادِ اسلامیہ'' کی یاد میں کہی

گئی اور جس میں دلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ ایسے عروس ہائے بلاد میں سے ایک ایک کا نام لے لے کر انتہائی رقّت انگیز پیرائے میں امت مسلمہ کی عظمت گزشتہ وسطوت پارینہ کا مرثیہ پڑھا گیا۔

یا پڑھیے علامہ اقبال کی وہ طویل نظم جو ''مسجد قرطبہ'' کے عنوان سے ''بال جبریل'' میں شامل ہے اس میں فکر وخیال کی عام بلند پروازی کے علامہ جذبہ ملی کی جو بے قراری از ابتدا تا انتہا جاری وساری ہے اس سے بھی قطع نظر صرف وہ اشعار پڑھیے جو براہ راست مسجد قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہے گئے ہیں اور اندازہ کیجیے جذبات ملی کے اس طوفان کا جو اس'' کافر ہندی'' کے قلب میں موجزن تھا! اور غور کیجیے اس کے دو آخری بندوں پر کہ کس خوبصورتی کے ساتھ امت مرحومہ کی تجدید واحیاء کا پیغام دیا گیا اور کیسے جذبہ پرور انداز میں ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی دعوت دی گئی

اور یہی دراصل علامہ مرحوم کی ملی شاعری کا وہ مثبت اور تعمیری پہلو ہے جو انہیں ملت کے سابق مرثیہ خوانوں سے ممتاز اور ممیّز کرتا ہے یعنی یہ کہ علامہ کے یہاں صرف درد انگیز نالے ہی نہیں ہیں انتہائی ولولہ انگیز پیغام عمل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک شاندار مستقبل کی خوشخبری بھی ہے جس نے یاس اور قنوطیت کی ظلمت کا پردہ چاک کر دیا اور دلوں میں امید کے چراغ روشن کر دیئے۔

یوں تو علامہ کے اشعار میں یہ امید افزا پیغام گویا رچا بسا ہوا ہے، چنانچہ بانگ درا کے متوسط حصے میں بھی جا بجا یہ رنگ موجود ہے کہ: ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اور ؎

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

لیکن خاص طور پر ''طلوع اسلام'' تو گویا از اوّل تا آخر ایک '' طبلِ رحیل'' ہے:۔ ؎

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیلؑ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اور ؎

سبق پھر صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامہ مرحوم کی یہ ملی شاعری' جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' حدود ارضی سے بالکل آزاد ہے اور ان کے اشعار کو پڑھتے ہوئے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ ان کا قائل کبھی ایک محدود خطہ ارضی میں بسنے والے مسلمانوں کے خصوصی مسائل کے بارے میں بھی غور کرتا ہوگا۔ گویا ان کی شاعری ''وَلٰکِنَّـہ اخلَدَ اِلیَ الاَرضِ ''(1) کے ہر شائبے سے بالکل پاک ہے۔ اندازہ کیجئے کہ ایک ہندی مسلمان ارض لاہور میں بیٹھا کہہ رہا ہے کہ :۔ ؎

---

(1) سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 177 کا ایک ٹکڑا۔ ترجمہ: ''لیکن وہ تو زمین کی جانب ہی جھکتا چلا گیا!''

طہران(1) ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

لیکن دوسری طرف اپنے گرد و پیش سے بھی بے خبر نہیں ہے بلکہ حالات کی نبض پر ہاتھ دھرے مسلمانان ہند کے مسائل کی تشخیص بھی کر رہا ہے اور ان کا حل بھی پیش کر رہا ہے!

ملت اسلامیہ کی تجدید اور امت مرحومہ کی نشاۃ ثانیہ کی جو فوری امید علامہ کو تھی محسوس ہوتا ہے کہ عمر کے آخری دور میں اسے بہت سے صدموں سے دوچار ہونا پڑا اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ بعد میں ایک قسم کی ناامیدی اور یاس کی سی کیفیت بھی علامہ مرحوم پر طاری ہوگئی تھی جو مثلاً اس

قسم کے اشعار سے ظاہر ہے کہ :۔

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

اور

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف!

لیکن اس کا اصل سبب یہ ہے کہ علامہ مرحوم نابغہ (GENIUS) اشخاص میں سے تھے، جن کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنے زمانے سے قدرے بعد کی باتیں کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقویم میں تیس چالیس سال کا عرصہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ علامہ مرحوم نے جس دور کا خواب دیکھا

---

(1) یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت طہران کے بجائے ارض لاہور کو عطا فرمادی جہاں ملت اسلامیہ کا یہ حدی خواں مدفون ہے۔ ابھی جو عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس کے موقع پر جناب وقار انبالوی نے علامہ مرحوم کی روح سے خطاب کر کے کیا خوب کہا۔

اے دیدۂ بیدار خودی! مرد قلندر! — رحمت ہے خدا کی ترے افکار مبیں پر
لاہور بنا ہے تری ملت کا جنیوا — کیا رنگ بہاراں ہے گلستان یقیں پر
تعبیر سے ہم دوش ہے اقبال ترا خواب — مسرور ہو تو خلد میں جمعیت دیں پر

تھا اس کی ابتداء ہو رہی ہے(1)۔

(3)
رومی ثانی

جہاں تک دین حق کے اسرار و رموز اور حقائق و معارف ایمانی اور علم و حکمت قرآنی کی ترجمانی کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم رومی ثانی تھے! انہوں نے علی الاعلان مولانا روم کو اپنا شیخ تسلیم کیا ہے اور ''پیر رومی'' کے ساتھ بحیثیت ''مرید ہندی'' کے مکالمات ان کے کلام کی

زینت ہیں‘‘ بلکہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی اس نسبت کا ذکر قدرے فخریہ انداز میں بھی کیا ہے یعنی

ع ’’برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است!‘‘ * (1)

---

(1)۔(پ۔ن۔نومبر 94ء) یہ بات راقم نے 3 مئی 1973ء کو کہی تھی اور بحمداللہ ایک سال سے کم مدت کے اندر اندر اس کی دو عظیم شہادتیں بھی رونما ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ایک طرف اکتوبر 73ء کی عرب اسرائیل جنگ میں ایک بالکل نیا نقشہ دنیا کی نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا چنانچہ وہی عرب جو بزدل اور بھگوڑے مشہور ہوگئے تھے، ان کی بہادری' جرات اور جانبازی کے چرچے عام ہوگئے اور وہ عالم عرب جس کا اختلاف وافتراق ضرب المثل بن چکا تھا دفعۃً ایک متحد قوت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آن کھڑا ہوا ـــــ یہاں تک کہ یہ ’’کنجشک فرومایہ‘‘ تیل کا ہتھیار استعمال کر کے امریکہ ایسے ’’شاہین‘‘ سے لڑ گیا! دوسری طرف فروری 74ء کی عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدلاہور نے عالم اسلام کے اتحاد کا ایک نہایت دلفرامنظر چشم عالم کے سامنے پیش کر دیا جس کی اہمیت کا اصل اندازہ اس سراسیمگی سے لگایا جاسکتا ہے جو اس وقت بھارت اور اس کے کارپردازوں پر طاری ہوگئی تھی۔

یہ دوسری بات ہے کہ علامہ اقبال ہی کے ان اشعار کے مصداق کہ دنیا کو ہے پھر معرکہ روح وبدن پیش۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا! اور ’’اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسہ۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا‘‘ دنیا کی ابلیسی قوتوں نے احیاءِ دین وملت کی اس چڑھتی لہر کو نہ صرف روک دیا بلکہ پسپائی پر مجبور کر دیا۔ تاکہ ہم اس کے بعد سے اب تک یہ لہر اتار اور چڑھاؤ کے کئی ادوار سے گزر کر بہر حال اس حد تک آگے بڑھ آئی ہے کہ پوری مغربی دنیا ’’مسلم فنڈامنٹلزم‘‘ سے خائف نظر آتی ہے۔ اور اگرچہ ابھی احیاءِ دین وملت کا یہ عمل مستقبل قریب میں بعض بڑے بڑے صدمات سے دوچار نظر آتا ہے تاہم بالآخر جو نوید جانفزا اقبال نے دی تھی وہ الفاظ قرآنی ”لترکبنّ طبقاً عن طبقٍ“ اور احادیث نبویہؐ میں وارد شدہ پیشینگوئیوں کے مطابق لازماً پوری ہو کر رہے گی۔ اور ع کہ بالآخر پوری کرۂ ارضی پر ’’خلافت علیٰ منہاج النبوت‘‘ کے نظام کا قیام اب بہت زیادہ دور نہیں ہے! (اسرار احمد 8 نومبر 94ء)

اب اگر مثنوی مولانا روم کے بارے میں عارف جامی کے یہ اشعار مبنی برحقیقت ہیں کہ:

مثنوی مولوی ءمعنوی ہست قرآں درزبانِ پہلوی (2)

من گویم وصفِ آں عالی جناب نیست پیغمبر ولے دارد کتاب (3)

تو یقیناً علامہ اقبال مرحوم بھی دور حاضر کے ’’ترجمان القرآن‘‘ قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

علامہ مرحوم خود بھی اس کے مدعی ہیں کہ ان کے اشعار فکر وپیغام قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور اس پر انہیں اس درجہ وثوق اور اعتماد ہے کہ انہوں نے مثنوی اسرار ورموز کے آخر

میں ''عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ'' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ :

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است (4)

پردۂ ناموس فکرم چاک کُن ایں خیابان راز خارم پاک کُن (5)

روز محشر خوار و رسوا کن مرا! بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا! (6)

آخری مصرع کو پڑھ کر ہر وہ شخص کانپ اٹھتا ہے جسے کسی بھی درجے میں علامہ کی نبی اکرم ﷺ سے محبت کا اندازہ ہے ____ اور واقعہ یہ ہے کہ خود میں نے جب بھی یہ اشعار پڑھے ایک مرتبہ ضرور جھرجھری سی آ گئی اور دل لرز اٹھا کہ اللہ اکبر! اپنے حق میں اتنی بڑی بددعا! لیکن پھر اس خیال سے تسکین ہوتی رہی کہ دراصل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کو کس درجہ پختہ یقین تھا اس بات پر کہ انہوں نے اپنے کلام میں قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے(1)

---

(1) یہاں راقم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چند سال قبل جب مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ آنکھ کے اپریشن کے لئے لاہور میں مقیم تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی تو فرصت کے اس وقت کا مصرف مولانا نے یہ نکالا کہ علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزار لیا۔ لاہور کے تمام رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر طویل عرصے تک ایک خاص کیفیت مولانا پر طاری رہی اور حسب عادت مولانا نے اپنے تاثر کا اظہار بھی برملا اور واشگاف الفاظ میں فرمایا۔ اس سلسلے میں مولانا کے تاثر کی شدت کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل دو جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جو راقم الحروف کے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں:
ایک یہ کہ ''قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!'' دوسرے یہ کہ ''اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حدی خواں اس امت میں پیدا ہوا لیکن یہ امت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہماشما کے کرنے سے کیا ہوگا!'' اسرار احمد

---

1 ____ روحِ دین کی تشریح و تعبیر

جہاں تک روحِ دین کی تشریح وتعبیر کا تعلق ہے۔علامہ مرحوم کی خدمات کو منفی ومثبت دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے_____ چنانچہ ایک طرف انہوں نے بنیادی اعتقادات اور اساسی فکر کے ضمن میں ہمہ اوستی نظریات اور شیخ ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کی عامیانہ تعبیرات کی پرزور تردید کی اور جواباً وہ نظریہ پیش کیا جو اقبال کے فلسفہ خودی کے نام سے موسوم ہے اور اصلاً حضرت مجددؒ کے نظریہ وحدت الشہود سے مشابہ ہے_____ اور دوسری طرف عبادات کے میدان میں نری رسم پرستی (RITUALISM) کی زوردار نفی کی اور اثباتاً عبادت کی اصل روح یعنی عشق ومحبت خداوندی پر زور دیا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک ہمہ اوست کی مختلف کی تعبیروں کے مابین فرق یا ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کی باریکیوں کا تعلق ہے ان کی وضاحت کا یہ مناسب موقع ہے۔نہ ہی میں اس کا اہل ہوں اور نہ ہی اس کا اصل مسئلے سے کوئی تعلق ہے۔واقعہ یہ ہے کہ مسائل بہت دقیق ہیں اور ان کا سمجھنا ہر کس وناکس کا کام نہیں۔اصل خرابی اس طرح واقع ہوئی کہ ان نظریات کا پرچار اشعار کے ذریعے کیا گیا جو زبان زد خواص وعوام ہو گئے۔اب خواص نے تو انہیں ہضم بھی کر لیا اور رچا پچا کر جزو بدن بھی بنالیا لیکن عوام کیلئے یہ زہر ہلاہل بن گئے اور انہوں نے ان کو عمل سے گریز اور فرار کا بہانہ بنالیا۔

اقبال کا جہاد اصلاً ان نظریات کے ان عمومی اثرات ہی کے خلاف ہے جو حافظؔ اور جامیؔ کے اشعار کے ذریعے عوام کے اذہان پر مترتب ہوئے اور جن کے نتیجے میں امت کے ایک بڑے حصے میں سُکر، جذب، ہستی اور بالآخر فنا کا ذوق تو پیدا ہو گیا لیکن عمل اور جہاد کا جذبہ ختم ہوتا چلا گیا۔

فلسفہ عِ خودی: بدقسمتی سے علامہ مرحوم کے فلسفہ خودی نے مختلف بلکہ متضاد تشریحوں اور تعبیروں کے باعث ایک چیستاں کی صورت اختیار کر لی ہے اور معاملہ بالکل وہی ہوا ہے کہ

ع ''شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا!''

آسان تفہیم کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ کے فلسفے کا بنیادی پتھر انسان کی ہستی کی نفی کے بجائے اثبات ذات خویش ہے نتیجۃً ان کے پیش نظر ''سلوک'' کی انتہائی منزل ''فنا فی اللہ'' نہیں

بلکہ ''بقاباللہ'' ہے۔

اس نکتے کی وضاحت کے لئے اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے میں خود علامہ مرحوم کی اس تحریر کے بعض حصے آپ کو سناتا ہوں جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی اس فرمائش پر کہ علامہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبان انگیریزی تحریر کر دیں، سپرد قلم کی تھی اور جسے پروفیسر موصوف نے ''مثنوی اسرار خودی'' کے ترجمے (SECRETS OF THE SELF) کے شروع میں شائع بھی کر دیا تھا۔ (مطبوعہ 1921ء) اپنی اس تحریر میں علامہ فرماتے ہیں!

''ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں میرا یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور ارباب وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیات کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی کو مٹا دے ___ میری رائے میں انسان کا خلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے۔۔قرب الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے بلکہ اس کے برعکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے (1) ___ میں نے افلاطون کے فلسفے پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیانہ مذاہب کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں ___ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہئے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے

---

(1) 1: یہاں علامہ مرحوم نے ''تَخَلَّقُوا بِاَخلَاقِ اللّٰہ'' کا حوالہ بطور حدیث رسولؐ دیا ہے لیکن اصلاً یہ الفاظ کسی حدیث کے نہیں بلکہ صوفیا کے ایک مشہور مقولے کے ہیں!

2: غالباً یہی مفہوم ہے علامہ مرحوم کے اس مشہور مصرع کا کہ ع یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ!

انسان مخالف قوتوں کا مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنا لے' اس وقت انسان

''خلیفۃ اللہ'' کے مرتبے کو پہنچ جائے گا (1)____''

میں اگر اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کروں تو وہ یوں ہوگی کہ اس پورے سلسلۂ کائنات مادی اور تمام عالم کون ومکان کی طرح خود انسان کا مادی وجود یا اس کا وجود حیوانی بھی خالص وہمی وخیالی اور اعتباری محض ہے' سوائے اس کی انا یا من یا ذات یا خودی کے جو دراصل عبارت سے اس کی اس روح سے جو اس کے وجود حیوانی میں پھونکی گئی اور جس کی اضافت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی طرف کی ہے بفحوائے آیۃ قرآنی: '' فَاِذَا سَوَّیتُه وَنَفَختُ فِیهِ مِن رُّوحِی فَقَعُوا لَه سَاجِدِینَ(2) ''یعنی جب میں اس کو پوری طرح درست کردوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب گر پڑنا اس کے لئے سجدے میں!____ یہ روح انسانی نہ وہمی و خیالی ہے نہ عارضی وفانی بلکہ حقیقی اور واقعی بھی ہے اور دائم و باقی بھی! خدا یا روح کائنات یا انائے کبیر اور اس روح انسانی یا انائے صغیر میں ایسا قریبی رابطہ اور لازم وملزوم کا رشتہ ہے کہ انسان اسے پہچان لے تو خدا کو جان جاتا ہے(3) اور اگر اسے نہ پہچان پائے تو کبھی خدا کی معرفت بھی حاصل نہیں کرسکتا یا عکساً یوں کہہ لیں کہ اگر کوئی خدا کو پہچان لے تو اپنی عظمت سے واقف ہو جاتا ہے اور اگر خدا کو بھلا دے تو اپنی حقیقت بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے(4)

خالق ومخلوق اور عبد ومعبود یا انائے کبیر اور انائے صغیر یا علامہ کے الفاظ میں انائے مطلق(INFINITE EGO) اور انائے محدود(FINITE EGO) کے مابین اصل رشتہ باہمی عشق اور محبت کا ہے بفحوائے آیات قرآنی:

---

(1) یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات!

وہ مذہب مردان خود آگاہ وخدا مست یہ مذہب مُلّا وجمادات ونباتات

(2) سورۃ الحجر آیت 29 اور سورۃ ص آیت 72

(3) یہ ترجمہ ہے صوفیاء کے اس مقولے کا جو عموماً حدیث رسول کی حیثیت سے بیان کردیا جاتا ہے یعنی: ''مَن عَرَفَ نَفسَهُ فَقَد عَرَفَ رَبَّه''

(4) ترجمہ ہے آیۃ قرآنی کا ''وَلَا تَکُونُوا کَالَّذِینَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنسٰهُم اَنفُسَهُم اُولٰئِكَ هُمُ الفٰسِقُونَ (سورۃ الحشر آیت 19)

وَالَّذِینَ اٰمَنُوا اَشَدُّ اور (حقیقی) ایمان والے سب سے زیادہ

حُبّاً لِلّٰہِ (البقرہ:166) شدید محبت کرتے ہیں خدا کے ساتھ!

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِینَ یُقَاتِلُونَ یقیناً اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے(1) ان لوگوں سے

فِی سَبِیلِہٖ (الصّف:5) جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں۔۔۔

اور اسی باہمی رشتہ الفت ومحبت کا مظہر خارجی ہے جسے قرآن ''ولایت باہمی'' سے تعبیر کرتا ہے:

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِینَ اٰمَنُوا(البقرہ285) اللہ اہل ایمان کا ولی ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَولِیآءَ اللّٰہِ لَا خَوف آگاہ ہو جاؤ اللہ کے ولیوں کے لئے نہ کوئی

عَلَیہِم وَلَا ھُم یَحزَنُونَ(یونس 63) خوف ہے نہ حزن!

اب ظاہر ہے کہ جس کسی کو اس عشق کی حقیقی لذت حاصل ہوگئی وہ اس کے دوام وبقا کا خواہشمند ہوگا نہ کہ اس کے انقطاع اور خاتمے کا! اور ظاہر ہے کہ بقائے عشق بقائے ذات پر منحصر ہے اور فنائے ذات کا لازمی نتیجہ خاتمہ عشق ہے۔ بس یہیں سے علامہ مرحوم کے فلسفے کا دوسرا اہم نکتہ سمجھ میں آ سکتا ہے یعنی عشق خداوندی اور اس کا دوام اور محبت الٰہی اور اس کا ''سوزِ ناتمام''۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیر دز وصل چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام (7)

یا دوام ما ز سوز ناتمام است چو ماہی جز تپش بر ما حرام است (8)

ہر لحظہ نیا طُور، نئی برق تجلی، اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

الغرض اثبات ذات خویش اور دوام عشق الٰہی علامہ مرحوم کے فلسفہ خودی کے دو ستون ہیں اور یہ دونوں ظاہر ہے کہ باہم لازم وملزوم۔ علامہ کے ان دو اشعار میں ان کا یہ باہمی لزوم بہت نمایاں ہے۔ یعنی

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حُسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

---

(1) اس آیہ کریمہ کو پڑھتے ہوئے میرا ذہن علامہ مرحوم کے اس شعر کی جانب لازماً منتقل ہو جاتا ہے کہ

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

اور

نہ ہو طغیان مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے ؟یہی طغیان مشتاقی

یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ اسی عشق الٰہی کا ایک عکس عشق رسول بھی ہے اس لئے کہ کون ہے جو نہیں جانتا کہ اطاعت ومحبت دونوں کے اعتبار سے اللہ اور رسولؐ ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ علامہ مرحوم کے کلام میں عشق رسولؐ کا جذبہ تانے بانے کے مانند پیوست ہے۔جیسے ؎

ہر کہ عشق مصطفیٰؐ سامان اوست بحر و بر در گوشۂ دامان اوست (9)

یا مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است (10)

روح شریعت: عشق الٰہی

روح دین کی تعبیر کے ضمن میں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا علامہ مرحوم کی دوسری بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے نری رسم پرستی اور خشک فقہی وقانونی موشگافی کی پرزور مذمت کی اور دین وشریعت کے جملہ مظاہر کی اصل روح باطنی عشق الٰہی کو قرار دیا۔اپنے مرشد کے اتباع میں جس نے نعرہ لگایا تھا کہ ؎

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علت ہائے ما (11)

انہوں نے بھی واشگاف الفاظ میں کہا ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدہ تصورات

اور ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب

اور فریاد کی کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

یا

رہ گئی رسم اذاں روح بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالیؒ نہ رہی

اس لئے کہ جملہ اعمال کی روح عشق الہیٰ ہے اسی کی لپک بلالؓ کی اذاں میں تھی اور اسی کی دمک تلقین غزالیؒ میں! بقول علامہ مرحوم ؎

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق دم جبرئیلؑ، عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام!
عشق کے مضراب سے نغمہ تار حیات!
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات!

اور ؎

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق!
معرکہ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق!

2۔نظام دین کی توضیح وتفسیر

نظام دین حق کی جو تشریح علامہ مرحوم کے کلام میں نظر آتی ہے اسے بغرض تفہیم تین اجزا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور یہ تینوں درحقیقت ایک ہی مرکزی نکتے کی شرح اور ایک ہی ''نقطہ توحید'' (Extension) کی حیثیت رکھتے ہیں:

ع ''یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں!''

(ا) مثلاً عام تمدنی اور معاشرتی سطح پر وحدت خالق ہی وہ اساسی تصور ہے جس سے وحدت

انسانیت کا خیال جنم لیتا ہے اور جس میں مزید گہرائی و گیرائی وحدت آدم کے تصور سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجۃً انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے اصول مستنبط ہوتے ہیں چنانچہ نظام دین حق کے اس پہلو پر بہت زور علامہ کے کلام میں پایا جاتا ہے میں اس وقت طوالت کے خوف سے ان دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔ مردمومن کی شان میں علامہ مرحوم فرماتے ہیں: ؎

کُلُّ مُومِن اِخوَۃٌ اندر دِلَش　　　حریت سرمایہ آب و گلش　　　(12)

ناشکیب امتیازات آمدہ　　　درنہاد او مساوات آمدہ　　　(13)

(ب) اسی طرح ہیت سیاسی کے ضمن میں توحید الٰہی ہی کے اصل الاصول سے مستنبط ہوتا ہے یہ اساسی قاعدہ کہ حاکمیت صرف خدا کے لئے ہے ماسویٰ کی حاکمیت پر مبنی نظام سیاسی مجسم شرک ہے غور کیجئے کہ کتنے سادہ لیکن پرشکوہ الفاظ میں ادا فرمایا ہے علامہ مرحوم نے یہ قاعدہ کلیہ: ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

کسی ہیت سیاسی میں تصور حاکمیت کے بعد سب سے اہم مسئلہ ''امر جامع'' کا ہے یعنی یہ کہ اس ہیت سیاسی میں شریک افراد کو باہم ایک دوسرے سے جوڑنے والی چیز کون سی ہے اس ضمن میں اس زمانے میں وطنی قومیت کا جو تصور پوری دنیا میں رائج ہے حیرت ہوتی ہے کہ علامہ مرحوم نے اس کی شناعت کا احساس کس شدت سے کیا اور اس شجر خبیثہ کی خباثت کا کس قدر صحیح اندازہ لگایا۔ سنیئے اور سردھنیے: ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعبیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے تر شوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے

غارت گر کا شانہ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

(ج) یہی معاملہ نظام معیشت کا بھی ہے توحید کا اصول جس طرح حاکمیت اور قومیت کے تمام مروجہ تصورات کی نفی کلی ہے اسی طرح ملکیت مطلقہ کے عام تصور کی بھی کامل نفی ہے ظاہر بات ہے کہ اگر ''مُلک'' اللہ کا ہے تو ''مِلک'' بھی اللہ ہی کی ہے اور اگر زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس سب کا ''مَلِک'' (بادشاہ) اللہ ہے تو یقیناً ''مالِک'' بھی اللہ ہی ہے۔

گویا انسان خود بھی اللہ کا ہے (اِنَّا لِلّٰہِ) اور جو کچھ اس کے پاس ہے خواہ وہ اس کی اپنی ذات اور اس میں مخفی قوتیں، صلاحیتیں اور اس کی مہلت عمر ہوں خواہ اس کا مال و اسباب یا زمین و جائیداد سب اصلاً اللہ کی ملکیت ہیں اور اس کے پاس اللہ کی امانت، جس میں تصرف کا اختیار تو اسے دیا گیا ہے لیکن اصل مالک کے احکام کے اندر اندر۔ ملکیت کے بجائے امانت کا یہ تصور توحید کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جس سے کوئی فرار ممکن نہیں۔ بقول شیخ سعدیؒ:

ایں امانت چند روزہ نزد ماست درحقیقت مالک ہر شے خداست (14)

افسوس کہ جب دین الٰہی کے چہرے پر ازمنہ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام کی نقاب پڑ گئی تو اس کی روئے منور کے دوسرے خدوخال کی طرح یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور یہ علامہ مرحوم کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا شاہکار ہے کہ انہوں نے نکتہ توحید کی اس لازمی توسیع (EXTENSION) کو بھی حد درجہ واضح الفاظ میں بیان کر دیا:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اور ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے باد سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نور آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

نہ صرف یہ بلکہ مرحوم نے اس اصول کو بھی بہت وضاحت کے ساتھ پیش فرما دیا جو تاریخ انسانی کے دوران پہلی بار خلافت راشدہ کے زمانے میں حضرت عمرؓ کی زبان مبارک سے ادا ہوا تھا، یعنی ریاست کی جانب سے تمام شہریوں کی کفالت عامہ۔ علامہ فرماتے ہیں: ؎

کس نباشد در جہاں محتاج کس نکتہ شرع مبیں ایں است وبس! (15)

اور ؎

جو حرف قُلِ العَفُوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

اس سلسلے میں حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں علامہ مرحوم کے یہ اشعار: ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ دستگیر بندۂ بے ساز و برگ! (16)
ہیچ خیر از مردک زرکش مجو! لَن تَنَا لُواالبِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا (17)
از رِبا آخر چہ می زاید؟ فتن! کس نداند لذت قرض حسن (18)

از ربا جاں تیرہ، دل چوں خشت وسنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ (19)
رزق خود را از زمیں بردن رواست

اینُ متاعُ بندہ و ملک ، خدا است (20)

بندۂ مومن امیں،حق مالک است　　غیرحق ہر شے کہ بینی ہالک است (21)

رایت حق از ملوک آمد نگوں　　قریہ ہاازدخل شاں خوار و زبوں (22)

آب و نان ماست از یک مائدہ　　دودۂ آدم ''کَنَفسٍ وَّاحِدَہ'' (23)

نقش قرآں تا دریں عالم نشست　　نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (24)

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ　　ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ (25)

محفل ما بے مے و بے ساقی است　　ساز قرآں را نواہا باقی است (1) (26)

---

(1) اشارہ اس حدیث نبویؐ کی طرف جس میں خبر دی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ باقی نہ رہے گا۔　(رواہ البیہقی عن علیؓ)

---

(4) اقبال اور قرآن

اب میں اس چوتھی اور آخری بات کے بارے میں کچھ عرض کر کے اپنی گزارشات ختم کر دوں گا جس کے ضمن میں مَیں نے ابتداء میں یہ عرض کیا تھا کہ اگر گمان ہے کہ مجھے علامہ مرحوم کی روح سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے ____ یعنی مرحوم کا تعلق قرآن حکیم سے اس موضوع کا اہم ترین حصہ تو پہلے ہی زیر بحث آ چکا ہے۔ یعنی یہ کہ علامہ مرحوم کی حیثیت فی الواقع ''ترجمان القرآن'' کی ہے اور جیسا کہ خود ان کا دعویٰ ہے ان کا فکر بھی قرآن ہی پر مبنی ہے اور ان کا پیغام بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے لہٰذا اب میں اس موضوع کے بعض ضمنی مگر نہایت اہم پہلوؤں کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کراؤں گا۔

(1) عظمت قرآن کا نشان

اس سلسلے میں سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دور میں علامہ مرحوم کی شخصیت عظمت قرآن کے ایک عظیم علَم اور نشان (SYMBOL) کی حیثیت

رکھتی ہے اس لئے کہ ایک عام آدمی کا متوارث عقیدے کے طور پر قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننا اور بات ہے اور ایک ایسے شخص کا قرآن پر وثوق و اعتماد اور ایمان و یقین جو فکر انسانی کی تمام وادیوں میں گھوم پھر چکا ہو اور مشرق و مغرب کے تمام فلسفے کھنگال چکا ہو بالکل دوسری بات ہے۔

سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل اور عظیم ترین معجزہ قرآن حکیم ہے اب خود اعجاز قرآنی کے پہلو بے شمار اور بے حد و نہایت ہیں جن کا احاطہ یا احصاء کسی فرد بشر کے لئے ممکن نہیں۔ اور میرے نزدیک اس دور میں اعجاز قرآنی کا عظیم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ کتاب جسے دنیا کے سامنے آج سے چودہ سو برس قبل عرب کے ایک امّی شخص (ﷺ وفداہ ابی وامّی) نے پیش کیا تھا آج بھی جبکہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے مادی علوم انتہائی بلندی کو چھو رہے ہیں اور علم و ہنر کی دنیا میں انقلاب آ چکا ہے' نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے!

اور اسی کی ایک گواہی اور شہادت ملتی ہے علامہ مرحوم کی زندگی سے کہ ایک شخص جس نے انیسویں صدی کے اواخر میں شعور کی آنکھ کھولی۔ پھر یہ نہیں کہ پوری زندگی ''بسم اللہ کے گنبد'' ہی میں بسر کر دی ہو بلکہ وقت کی اعلیٰ ترین سطح رپ علم حاصل کیا، مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھے، قدیم و جدید سب کا مطالعہ کیا ــــــ لیکن بالآخر اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے' اور اس کی علم کی پیاس کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے' گویا بقول خود ان کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

کیا اس دور میں قرآن حکیم کے ''ھُدًی لِّلنّاس'' ہونے کے لئے کسی اور دلیل کی حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ اور کیا یہ کافی ثبوت نہیں ہے اس کا کہ قرآن ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے انسان کی فکری رہنمائی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے؟

(2) واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن

اور اسی کا ایک عکس سمجھئے اس حقیقت کو کہ اس دور میں عظمت قرآن اور مرتبہ و مقام قرآن کا انکشاف بھی جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو! اس لئے کہ عظمت قرآنی کا انکشاف بہر حال کسی شخص پر اس کے اپنے ظرف ذہنی کی

وسعت اور عُمق کی نسبت ہی سے ہوسکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ جب قرآن کا ذکر کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ع ’قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید‘ کے مصداق وہ فی الواقع جمال وجلال قرآنی کا مشاہدہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے کر رہے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شنید نہیں‘ دید پر مبنی ہے‘ بلکہ ایسے لگتا ہے جیسے ان کا پورا وجود کلام پاک کی عظمت کے بارِگراں سے ’’خَاشِعاً مُتَصَدِّ عَا‘‘ ہوا جا رہا ہے، عظمت قرآنی کا احساس وادراک ان کے ریشے ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور ان کا ہر بُن مُو قرآن کی جلالت قدر اور رفعت شان کے ترانے گا رہا ہے۔ ذرا گوشِ ہوش سے سنئے:

آں کتاب زندہ، قرآن حکیم
حکمتِ اولا یزال است وقدیم (27)

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات (28)

حرفِ او را ریب نے‘ تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے (29)

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃٌ لِلّعَالَمِیں (30)

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند (1)
از کتابے صاحبِ دفتر شدند (31)

آنکہ دوشِ کوہ بارش برنتافت
سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت (32)

اور سوچئے کہ کیا اس کلام میں دور دور بھی کسی آورد کا سراغ ملتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ آمد ہی آمد ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ قائل کا قول نہیں، حال ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ’’از دل خیزد بردل ریزد‘‘ اعلیٰ مثال ہے۔

اور اسی پہ بس نہیں، آگے بڑھیے اور سنیے:

فاش گویم آنچہ دردل مضمرات
این کتابے نیست چیزے دیگراست (33)
مثلِ حق پنہاں وہم پیداست ایں
زندہ وپائندہ وگویاست ایں (34)
صد جہاں تازہ درآیات اوست
عصرہا پیچیدہ درآنات اوست (35)

بات کتنی سیدھی اور سادہ معلوم ہوتی ہے،قرآن عام معروف معنوں میں کتاب نہیں یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام خود متکلم کی صفت اور اس کی جملہ صفات کا مظہر ہوتا ہے لہٰذا قرآن مثل ذات باری تعالیٰ 'ظاہر' بھی ہے 'باطن' بھی اور 'زندہ' بھی ہے 'قائم ودائم' بھی۔ پھر نہ ذات باری زمان و مکان کی مقید ہے نہ کلام الہٰ ان کا پابند بلکہ جیسے خود اللہ تعالیٰ اول بھی ہے اور آخر بھی اور زمان و مکان کُل کے کُل وجود باری میں 'گُم' ہیں اسی طرح کلام الٰہی کے بھی ''صید زبوں'' کا درجہ رکھتے ہیں اور جس طرح اللہ کی شان یہ ہے کہ ''كُلَّ يَومِ هُوَفِي شَان ''اسی طرح قرآن حکیم بھی ہر دور کے افق پر ایک خورشید تازہ کے مانند طلوع ہوتا رہے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کم از کم میرے محدود علم اور مطالعے میں قرآن حکیم کی اس سے زایدہ مدح وستائش ہماری پوری تاریخ میں موجود نہیں۔! اب ظاہر ہے کہ تعریف معرفت کی مناسبت ہی سے کی جاسکتی ہے بس اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ عظمت قرآنی کے کتنے بڑے عارف تھے علامہ اقبال مرحوم!

اور یہیں سے سمجھ میں آسکتی ہے یہ بات کہ کیوں اس قدر دکھ تھا علامہ مرحوم کو امت کی قرآن مجید کی جانب عدم توجہ کی روش سے جس کا مرثیہ ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے اور کیوں ان کا دل حساس خون کے آنسو روتا ہے اس پر کہ مسلمانوں کو عام اس سے کہ وہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے قرآن سے نہ اعتناء ہے نہ دلچسپی! غور فرمایئے کہ کتنی تلخی ہے علامہ کے اس شعر میں کہ :

بآیاتش تُرا کارے جُز ایں نیست!
کہ از یاسینِ اُو آساں بمیری!! (36)

اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے علامہ مرحوم نے امت مسلمہ کے مختلف طبقات کا:۔

صوفی پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست (37)

آتش از شعرِ عراقی در دِلش
در نمی او پست وحرفِ اُو بلند (38)

واعظ دستاں زن افسانہ بند
معنی و پست وحرف او بلند (39)

از خطیب و دیلمی گفتار او
با ضعیف وشاذ و مرسَل کارِ اُو (40)

رہئے ''فقیہانِ حرم''، تو ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ:۔

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

لہٰذا اب عوام کا تو کہنا ہی کیا، وہ غریب تو ہیں ہی ''کشتہ ملاّئی وسلطانی و پیری''، ان کی عظیم اکثریت بے ذوق بھی ہے اور بے طلب بھی اور بقول علامہ مرحوم۔

صاحب قرآن و بے ذوق طلب!
العجب، ثمّ العجب، ثمّ العجب! (41)

اور ظاہر ہے کہ یہاں طلب سے مراد تعمیر خودی کی طلب بھی ہے اور غلبہ حق کی آرزو بھی اس لئے کہ فی زمانہ یہی دونوں نایاب ہیں اور بقول علامہ مرحوم۔

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

رہی دنیوی آرزوؤں اور طول امل کا جال تو اس میں تو ہر شخص ہی ع ''کہ ہستم اسیر کمند ہوا!'' کے مصداق بری طرح جکڑا ہوا ہے۔

ملت اسلامی کے اس حال زبوں کے بارے میں علامہ فرماتے ہیں:

پیش ما یک عالم فرسودہ است
ملت اندر خاک او آسودہ است (42)

رفت سوز سینہ تا تارو کرد
یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد! (43)

(3) داعی الی القرآن

علامہ مرحوم کے نزدیک قرآن سے یہی دوری اور کتاب الٰہی سے یہی بُعد اصل سبب ہے مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور امت مسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلت و خواری کا! ''جواب شکوہ'' میں جو بات انہوں نے حد درجہ سادہ الفاظ میں فرمائی تھی کہ :۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

بعد میں اس کا اعادہ نہایت پر شکوہ الفاظ اور حد درجہ درد انگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا کہ

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی (44)

اے شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتاب زندۂ (45)

اور اب ان کے نزدیک اسی ''کتاب زندہ'' سے وابستہ ہے ان کا 'احیا' اور اسی پر دار و مدار ہے ان کی نشاۃ ثانیہ کا! گویا مسلمانوں کی حیات تازہ کا انحصار ہے ان کے از سر نو حقیقتاً مسلمان ہونے پر اور ان کے مسلمان ہونے کا دار و مدار ہے قرآن حکیم پر ـــــ یا یوں کہہ لیں کہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ وابستہ ہے 'احیائے اسلام' سے اور احیائے اسلام وابستہ ہے 'احیائے قرآن' سے جو عبارت ہے مسلمانوں کے اس کے ساتھ صحیح تعلق کی از سر نو استواری سے! علامہ فرماتے ہیں :۔

اے گرفتار رسوم ایمان تو
شیوہ ہائے کافری زندان تو! (46)
قطع کردی اَمرِ خود را در رُبُو

جادہ پیمائی اِلیٰ شَیءٍ نُکُر (47)

گرتو می خواہی مسلماں زیستن

نیست ممکن جز بقرآں زیستن (48)

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب

تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب (49)

علامہ کے نزدیک علم ہے تو صرف علم قرآنی اور حکمت ہے تو صرف حکمت قرآنی اور یہی علم وحکمت قرآن ہے جو اگر کسی کے ذہن میں سرایت کر جائے اور قلب میں رچ بس جائے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے جو منتج ہوتا ہے ظاہر کے انقلاب پر اور یہی عمل ہے جو بالآخر ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم وہ کتاب ہے کہ :ے

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود (50)

اور کس خوبصورتی سے مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس قرآن کے ذریعے ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جاؤ:ے

بندۂ مومن زآیات خداست

ایں جہاں اندر براو چوں قباست! (51)

چوں کہن گردد جہانے در برش

می ہد قرآں جہانے دیگرش (52)

یک جہانے عصر حاضر را بس است!

گیر اگر در سینہ دل معنی رس است! (53)

اور کہیں للکارتے اور غیرت دلاتے ہیں کہ :ے

اے کہ می نازی بہ قرآن عظیم

تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم؟ (54)

در جہاں اسرار دیں را فاش کن

نکتہ شرع مبیں رافاش کن (55)

علامہ کے نزدیک تطہیر ذہن اور تعمیر فکر کا واحد ذریعہ تو یہ ہے ہی کہ ''اسرار دیں'' فاش کئے جائیں اور نوع انسانی کے سامنے ''نکتہ ہائے شرع مبیں'' کی وضاحت کی جائے، خود تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تجلیہ روح کا کارگر اور موثر ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کشتن ابلیس کارے مشکل است

زانکہ او گم اندر اعماق دل است (56)

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی

کشتہ شمشیر قرآنش کنی (57)

اور

جز بقرآں ضیغمی روباہی است

فقر قرآں اصل شہنشاہی است (58)

فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر

فکر را کامل ندیدم جز بذکر (59)

لیکن یہ ذکر صرف زبان سے ہی نہیں پورے وجود سے ہونا چاہیے:

ذکر؟ ذوق و شوق را دادن ادب

کار جان است ایں نہ کار کام و لب (60)

الغرض علامہ کے نزدیک امت کے جملہ امراض کے لئے نسخہ شفا بھی قرآن حکیم ہے اور ملت کے تن مردہ میں از سر نو جان ڈالنے کے لئے آب حیات بھی چشمہ قرآنی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات

در ضمیرش دیدہ ام آب حیات (61)

می دہد مارا پیام لَا تَخَف

می رساند بر مقام لَا تَخَف (62)

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام
شرح رمز صِبغَتُ اللہ گفتہ ام (63)
فکر من گردوں مسیر از فیض اوست
جوئے ساحل ناپذیر از فیض اوست (64)
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثل تیغ بے نیام! (65)

اور

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآں زندہ است! (66)
ماہمہ خاک و دل آگاہ اوست
اعتصامش کن کہ حَبلُ اللہ اوست (67)
چوں گہر در رشتہ او سفتہ شو!
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو! (68)

گویا احیائے دین کی جدوجہد ہو یا تجدید ملت کی سعی، علامہ مرحوم کے نزدیک اس کا مرکز و محور ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ ہے قرآن حکیم اور یہی معنی ہیں قرآن حکیم کی اس آیت کے جو نبی اکرم ﷺ کے طریق کار اور منہج انقلاب کی وضاحت کے ضمن میں معمولی سے لفظی فرق کے ساتھ قرآن مجید میں چار مقامات پر وارد ہوئی ہے یعنی: یَتلُوا عَلَیھِم اٰیَاتِہٖ وَیُزَکِیھِم وَیُعَلِّمُھُمُ الکِتَابَ وَالحِکمَۃَ اور یہی ہے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کرنے کا وہ اصل کام جس پر ایک طویل عرصے تک ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر میری نگاہ جم گئی ہے کہ ''جا ایں جا است''!

---

(1) یہ دراصل نام ہے میرے ایک کتابچے کا جو میری اس تحریر پر مشتمل ہے جو میں نے جون 67ء میں 'میثاق' کے صفحات میں لکھی تھی اور جو میری موجودہ سرگرمیوں کے لئے بمنزلہ اساس ہے اس کے اب تک آٹھ ایڈیشن ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام''

کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔اس کا انگریزی میں ترجمہ برادر عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلمہ نے کیا ہے جسے مکتبہ انجمن نے شائع کیا ہے۔(اسرار احمد)

هُوَ الَّذِی اَرسَلَ رَسُولَه' بِالهُدیٰ وَدِینِ الحَقِّ لِیُظهِرَه' عَلیَ الَّدِینِ کُلِّه(التوبة :33، الفتح:28،الصّف:9)

اردو ترجمہ اشعار فارسی

(1) ایک برہمن زادہ (یعنی علامہ اقبالؔ خود) روم (مراد ہیں مولانا رومؔی) اور تبریز (مراد ہیں شمس تبریزی) کے علوم کا حامل اور ان کے اسرار و موز سے واقف ہے۔

(2)و(3) مثنوی مولوی معنوی یعنی مثنوی مولانا رومؔ دراصل فارسی زبان میں قرآن ہی کی ترجمانی ہے اور میں ان (مولانا رومؔ) کی صفات اس کے علاوہ اور کیا بیان کروں کہ وہ اگرچہ پیغمبر نہیں ہیں لیکن انہیں کتاب بہرحال عطا ہوئی ہے۔

(4) تا(6) اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو، اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور کی ترجمانی ہے تو (اے نبی ﷺ) آپ میرے فکر کے ناموس کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیں!

(7) تو ابھی اس راز سے آگاہ نہیں ہوا کہ وصل سے شوق ختم ہو جاتا ہے (کاش کہ تو جان لے کہ) ہمیشہ کی زندگی کیا ہے؟ مسلسل سلگتے رہنا! (نہ کہ ایک بار بھڑک کر ختم ہو جانا!)

(8) ہماری بقا سلگتے رہنے ہی میں ہے۔اور ہم پر مچھلی کی طرح تڑپتے رہنے کے سوا ہر شے حرام ہے۔

(9) جسے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ محبت کی دولت حاصل ہے تو گویا دنیا کا کل خشک و تر اس کے دامن کے ایک گوشے میں موجود ہے۔

(10) خود کو درِ مصطفیٰؐ تک پہنچا کر دم لو۔اس لئے کہ اگر تم اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آ سکے گا!

(11) اے مرے جذبہ عشق، اے میری عزیز متاع اور اے میرے جملہ امراض کے معالج، تو سدا شاد و آباد رہے!

(12)و(13) اس کے (یعنی بندۂ مومن) کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ ''تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں!'' اسی طرح جذبہ حریت بھی اس کے ضمیر میں رچا بسا ہوا ہے وہ (نسلی، لسانی یا علاقائی) امتیازات سے بالکل ناواقف ہے اور مساوات اس کی سرشت میں موجود ہے!

(14) یہ (میرا جملہ مال و اسباب دنیوی) میرے پاس ایک عارضی امانت ہے ورنہ ہر شے کا مالک حقیقی تو خدا ہی ہے!

(15) شریعت حقہ اور نظام اسلامی کا اصل مقصود یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

(16) (جانتے ہو؟) قرآن کی حقیقت کیا ہے؟ سرمایہ دار کے لئے موت کا پیغام اور بے سروسامان لوگوں کا سہارا و آسرا!

(17) دولت سمیٹنے والے سے کسی بھلائی کی توقع نہ کرو۔ (اس لئے کہ قرآن نے صاف فرما دیا ہے کہ) تم نیکی کا مقام ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک (بجائے سمیٹنے اور جمع کرنے کے) خرچ کرنے کی عادت نہیں!

(18) سود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہو سکتا ہے؟ (افسوس کہ) بغیر سود قرض دینے کی لذت کسی کو معلوم نہیں!

(19) سود سے روح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور انسان بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے۔

(20) زمین سے اپنے لئے رزق کا حصول جائز ہے۔ (لیکن) یہ انسان کے لئے صرف استعمال کی چیز ہے ملکیت صرف خدا کی ہے۔

(21) بندۂ مومن (اپنے مال و متاع کا صرف) امین ہے مالک خدا ہے۔ خدا کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو سب فانی اور ہلاک ہو جانے والا ہے!

(22) حق کا پرچم بادشاہوں کے باعث نیچا ہو جاتا ہے اور ان کی وجہ سے بستیاں کی بستیاں

خوار و بدحال ہو جاتی ہیں۔

(23) ہمارا آب و دانہ ایک ہی دسترخوان سے ہے۔اس لئے کہ آدم کا پورا خاندان ایک جان کے مانند ہے۔

(24) جب اس دنیا میں قرآنی تعلیمات کا سکہ چلا تو کہانت اور پاپائیت ایسے تمام گمراہ کن سلسلوں کا زور ٹوٹ گیا۔

(25) مسلمانوں سے کہو کہ جان ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لئے کمر کس لیں) اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں!

(26) (لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ) ہماری محفل ساقی اور شراب سے تہی دست رہ گئی ہے یعنی قرآن کے ساز کی صرف آواز ہی آواز باقی رہ گئی ہے!

(27) وہ زندہ کتاب قرآن حکیم جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!

(28) زندگی کے وجوہ میں آنے کے رازوں کا خزینہ جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

(29) اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ ردوبدل کی گنجائش اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں!

(30) نوع انسانی کے لئے (خدا کا) آخری پیغام جس کے لانے والے تمام جہانوں کے لئے رحمت قرار پائے (ﷺ!)

(31) اسے یاد کر لینے کے باعث یا اس کی حفاظت میں آ کر رہزن اور لٹیرے رہبر و رہنما بن گئے اور اس ایک کتاب کے طفیل وہ خود بہت سی کتابوں کے مصنف بن گئے!

(32) وہ (کتاب) کہ جس کے بوجھ کو پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے اور جس کے دبدبے سے آسمان کا پتہ بھی پھٹ کر رہ گیا!

(33) (اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

(34) یہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی

اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!

(35) اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں!

(36) (لیکن افسوس کہ اے مسلمان!) تجھے اس کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۃ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے!

(37) ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے!

(38) اس کے دل میں عراقیؔ کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(39) (دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے!

(40) اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادیؒ سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمیؒ سے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف، شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے

(41) کوئی صاحب قرآن ہو اور پھر بھی اس میں نہ جذبہ ہو نہ حوصلہ و امنگ یہ کتنی تعجب خیز اور حیرت آمیز بات ہے!!

(42) ہمارے سامنے ایک پرانا اور گھسا پٹا عالم ہے اور ملت اسلامی اس کی خاک نشینی ہی میں آسودگی محسوس کر رہی ہے۔

(43) (مسلمان اقوام مثلاً) مغلوں اور کردوں کے سینے حرارت سے کیوں خالی ہو گئے؟ آیا مسلمان پر موت طاری ہو گئی ہے یا خود قرآن ہی کے حیات بخش سوتے خشک ہو گئے ہیں۔

(44) (اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہو گیا ہے لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردش زمانہ کو دے رہا ہے!

(45) اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے!) اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتاب زندہ موجود ہے! (جس کے ذریعے تو دوبارہ بام عروج پر پہنچ سکتی ہے!)

(46) اے مسلمان! تیرا ایمان رسومات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور تو خود کفر کے طور طریقوں کے زندان میں اسیر و مقید ہے!

(47) تو نے اپنی وحدت ملی کو پارہ پارہ کر لیا ہے اور اب ایک خوفناک انجام کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے!

(48) (اب) اگر تو (دوبارہ) مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے تو (اچھی طرح جان لے کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیات نو کی بنیاد قرآن پر قائم کرے!

(49) اس کتاب کا حق تلاوت تم ادا کر دو۔ پھر جو مقصد و مطلب چاہو حاصل کر لو!

(50) (یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لئے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!

(51) بندۂ مومن آیات خداوندی میں سے ہے اور اس عالم کی حیثیت بس ایسی ہے جیسی اس کے لباس میں ایک قبا!

(52) جب اس کے لباس کی کوئی قبا یعنی کوئی عالم پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اسے ایک جہان تو عطا فرما دیتا ہے!

(53) عصر حاضر کو بھی بس ایک ایسا ہی جہان نو درکار ہے (جو قرآن سے ماخوذ اور مستنبط ہو!) اے مسلمان اگر تیرے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو معانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہو تو (مجھ سے) یہ راز کی بات حاصل کر لے!

(54) اے وہ شخص یا قوم جسے حامل قرآن عظیم ہونے پر فخر ہے آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہو گے!

(55) (اٹھو اور) دنیا میں دین حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعت اسلامی کے رموز حکم

کی تشہیر واشاعت کے لئے سرگرم ہو جاؤ!

(56) شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے اس لئے کہ اس کا بسیرا نفس انسانی کی گہرائیوں میں ہے!

(57) بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآن حکیم کی (حکمت وہدایت) کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنالیا جائے!

(58) قرآن کے بغری شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔

(59) جانتے ہو یہ قرآن کا فقر کیا ہے؟ یہ ذکر اور فکر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فکر کامل نہیں ہوسکتا۔

(60) (لیکن یہ بھی جان لو کہ ذکر کی حقیقت کیا ہے) ذکر اصل میں ذوق وشوق کو صحیح راہ پر ڈالنے کا نام ہے یہ محض زبان اور ہونٹوں کا وظیفہ نہیں بلکہ کامل وجود اور وری ہستی کے ساتھ کرنے کا کام ہے۔

(61) (اے مسلمان) اگر دوام وثبات اور قوت واستحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دست سوال دراز کر۔ اس لئے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آب حیات کا سراغ ملا ہے!

(62) یہ ہمیں بے خوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا بالفعل اس مقام تک پہنچا بھی دیتا ہے جہاں نہ خوف باقی رہتا ہے (نہ حزن!(

(63) میں نے قرآن کے بحر بیکراں کے موتی بیندھ لئے ہیں اور ''صِبغَة الله'' کے اسرار ورموز کی شرح بیان کر دی ہے۔

(64) میرے فکر کی یہ بلندی اور گردوں نوروی سراسر قرآن ہی کے فیض سے ہے اور اسی کے طفیل میرے خیالات میں بحر بیکراں کی سی وسعت پیدا ہوگئی ہے!

(65) پس (اگر خدا توفیق دے تو) میرے شراب کے ایک دو جام چڑھا یعنی میرے فکر اور پیغام سے سرشار ہو کر آمادہ عمل ہو جاتا کہ تو شمشیر برہنہ کے مانند چمکنے لگے!

(66) وحدت آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملت اسلامی کے جسد ظاہری میں روح باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔

(67) ہم تو سرتا پا خاک ہی خاک ہیں، ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔

(68) (اے ملت اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو) اپنے آپ کو موتیوں کی طرح قرآن کے رشتے میں بیندھ اور پرو لے۔ ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دھول کے مانند پریشان اور منتشر (اور ذلیل وخوار) رہ!

****